MAUR101CCT

لسانیات

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

برائے

ایم۔اے۔اردو

(پہلا سمسٹر)

پہلا پرچہ

نظامتِ فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

©Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course : M. A. Urdu

Edition: 2021

ناشر	:	رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد
اشاعت	:	2021
تعداد	:	1000
قیمت	:	
ترتیب وتزئین	:	ڈاکٹر محمد نہال افروز (گیسٹ فیکلٹی)، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد
سرورق	:	ڈاکٹر محمد اکمل خان (گیسٹ فیکلٹی)، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد

لسانیات

For M. A. Urdu 1st semester

Paper 1st

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in **Publication:** ddepublication@manuu.edu.in

Phone: 040-23008314 **Website:** manuu.edu.in

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

مجلسِ اِدارت

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس

صابق صدر، شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

پروفیسر ابوالکلام

شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

پروفیسر نکہت جہاں

پروفیسر (اردو)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر ارشاد احمد

اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر محمد نہال افروز

گیسٹ فیکلٹی (اردو)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر محمد اکمل خان

گیسٹ فیکلٹی (اردو)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد-32، تلنگانہ، بھارت

اکائی 13 : زبان کی تعریف اوراس کے آغاز کے مختلف نظریات

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 زبان کی تعریف اوراس کے آغاز کے مختلف نظریات
13.2.1 لسانیات کی شاخیں
13.2.2 علم لسانیات کے اجز
13.3.3 زبان کا منصب
13.2.4 بولیوں کا علم (Dialectology)
13.2.5 زبان کی اقسام
13.2.6 زبان کے آغاز کے مختلف نظریات
13.3 اکتسابی نتائج
13.4 کلیدی الفاظ
13.5 نمونہ امتحانی سوالات
13.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

13.0 تمہید

زبان (Language) دراصل اصوات کے اس بامعنی مجموعے کا نام ہے جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے تاکہ اپنے ہم جنس افراد سے تبادلہ خیال کر سکے۔ چونکہ انسان ایک سماجی جاندار ہے اور مہد سے لحد تک اپنے ابنائے جنس کے ساتھ مل کر رہنا چاہتا ہے اس لیے اپنی سماجی ضرورتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وہ مختلف طرح کی آوازوں سے کام لیتا ہے۔ دوسروں سے اپنے دل کی بات کہنے اور ان سے ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اسے زبان کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ اسی والہانہ محبت اور بے اندازہ شغف کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا میں لاتعداد زبانیں بولی جاتی ہیں جو اپنے

اپنے بولنے والوں کی خاطر خواہ خدمت کررہی ہیں پھر بھی ہر خطے کا انسان اپنی زبان کو غیر زبان پر ترجیح دیتا ہے۔اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج روئے زمین پر صرف ایک ہی زبان رائج ہوتی۔اس طرح زبان کی تاریخ انسانی معاشرہ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔زبان دراصل ایک تقلیدی عمل کا نام ہے جو اپنے گردوپیش کے دوسرے انسانوں کو دیکھ کر اختیار کی جاتی ہے۔جس وقت انسان پہلی بار آنکھیں کھولتا ہے اس کے صوتی عضلات و مخارج اس قدر مکمل ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کی آوازوں کی بے اختیار نقل کرنا شروع کر دیتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اسی زبان میں سوچنے، سمجھنے اور خواب دیکھنے لگتا ہے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ 'زبان' (Language) کسے کہتے ہیں اور یہ کس طرح وجود میں آتی ہے۔

☆ مختلف دانشوروں نے 'زبان' کی تعریف کے بارے میں کیا خیالات ظاہر کیے ہیں۔

☆ 'زبان' کے وجود اور اس کے آغاز سے واقف ہو جائیں گے۔

☆ عالمی سطح پر 'زبان' اور ان کے خاندانوں سے واقفیت ہو جائے گی۔

13.2 زبان کی تعریف اور اس کے آغاز کے مختلف نظریات

زبان ایک ایسی نعمت ہے جس کی بدولت انسان اپنے خیالات و احساسات کو الفاظ کے سہارے دوسروں تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔زبان ہی کے ذریعہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر سکتا ہے اور اس بات چیت کے ذریعے علم، عقائد، رائے، خواہشات، خطرات، حکم، شکریہ، وعدے اور احساسات جیسے عمل اور ردعمل کا تبادلہ کرتا ہے۔وہ اپنی ہنسی کے ذریعے تفریح اور خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور غصہ و برانگیختگی ظاہر کرنے کے لیے کرخت اور کریہہ آوازوں کا استعمال کر سکتا ہے۔وہ مسکرا کر کسی بات کی منظوری یا نامنظوری ظاہر کرتا ہے۔چیخ کر غصہ اور تلخ احساسات کا اظہار کرتا ہے اور کبھی جوش وخروش یا خوف کا اظہار بھی کرتا ہے۔اس کی پیشانی پر حیرت، تعجب یا پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے لیکن ان سب کے باوجود انسان کے تبادلۂ خیالات کا سب سے بہتر نظام زبان ہے، جس کی بنیاد الفاظ اور جملوں کی بامعنی ترتیب پر قائم ہوتی ہے۔تبادلہ خیال یا ترسیلی نظام کو لسانی ترسیلی نظام یعنی Verbal communication کہتے ہیں۔ جب کہ دوسرے تمام ترسیلی نظام کو غیر لسانی ترسیلی نظام non-verbal cummunication کہا جاتا ہے۔

زبان ایک سماجی شے ہے، اس کا استعمال سماج ہی میں ہوسکتا ہے۔زبان موروثی نہیں ہوتی یعنی کسی مخصوص زبان کو بولنے کی صلاحیت والدین کی طرف سے اولاد کو منتقل نہیں ہوتی۔زبان میں طرح طرح کے اظہارات کی لامحدود گنجائش ہے۔ہم اس کی اکائیوں کی متنوع ترتیبوں سے لامحدود پیغامات کی ترسیل کر سکتے ہیں۔گویا زبان وہ ذریعہ (Medium) ہے جس کی مدد سے انسان اپنے مافی الضمیر کو ایک فرد سے دوسرے فرد تک منتقل کرتا ہے۔اس ضمن میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جانور بھی احساسات وخیالات رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے جذبات واحساست اور خیالات کا تبادلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس الفاظ کا وہ نظام (زبان) نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ ترسیلی نظام سے مستفید ہوں۔ان معنوں میں انسان اور جانور میں زبان کا فرق واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان خصوصی طور پر انسانی ملکیت ہے۔گویا زبان سے مراد وہ زبان ہے جو

انسان گفتگو میں بالعموم استعمال کرتا ہے۔ زبانیں ہزارہا ان علامات اور نشانات پر مشتمل ہوتی ہیں جو فارم اور معنی سے تشکیل پاتے ہیں۔ تقریری زبان میں یہ فارم صوت یا آواز ہے، جبکہ تحریری زبان میں یہ فارم حروف ہیں۔ مثال کے طور پر حروف یا اصوات کی ترتیب سے لفظ بنتے ہیں اور لفظوں کی ترتیب سے جملے بنائے جاتے ہیں۔

مختلف زبانوں میں 'زبان' کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جبکہ 'زبان' بذات خود فارسی کا لفظ اور اسم مونث ہے۔ یہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو منہ کے اندر رہتی ہے اور قوت ذائقہ کا کام انجام دیتی ہے ساتھ ہی اس کا کام اصوات کو نکالنا بھی ہے۔ ہر زبان کے تلفظی مخارج اس کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے گویا یہ سب مخرجوں کی سردار ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ 'لسان' ذومعنی حیثیت رکھتا ہے اور 'زبان' کو ہر دو مطالب کے لیے بیان کرتا ہے یعنی زبان بطور عضو انسانی اور زبان بطور ذریعہ بیان و اظہارِ مطالب۔ 'لسان' عربی زبان کا لفظ اور اسم مفرد مونث ہے جس کے لغوی معنی 'زبان' یا 'بھاشا' کے ہیں جبکہ اصطلاح میں یہ خیالات کے اظہار کا وہ ذریعہ ہے جو ملفوظ آوازوں کی مدد سے انسان کے مطالب و مقاصد کو ایک سے دوسرے تک منتقل کرتا ہے۔ یونانی زبان میں ''علم لسانیات'' کے لیے 'فلولوجی' کی اصطلاح رائج ہے، جو دو الفاظ کا مجموعہ ہے: 'فیلو' کے معنی ہیں محبت اور 'لوجی' کے معنی ہیں لفظ، علم وغیرہ یعنی زبان کا علم۔ عربی لفظ 'لسان' سے لسانی اور لسانی سے لسانیات بنا ہے، جبکہ انگریزی میں یہ لنگواسٹک (Linguistic) کہلاتا ہے جو زبان ہی کے مطالعہ کا علم ہے۔ اس علم میں ایک زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ یہ ایک مستقل علم ہے، جس کی اہمیت عصر حاضر میں مزید بڑھ گئی ہے۔ زبانوں کی ساخت اور ان کے اصوات میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث سماجی علوم یعنی بشریات، نفسیات، عمرانیات، تاریخ اور فلسفہ کے میدانوں میں بے پناہ نتائج حاصل کیے گئے ہیں، زبانوں کے آپس میں ربط اور معاشرہ پر اس کے اثرات کے ساتھ ساتھ آئے دن اس میں رونما ہونے والے تغیرات لسانیات کا ہی موضوع ہیں۔ 'زبان' کی تعریف کرتے ہوئے مولوی عبدالحق قواعد اردو میں کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ ''زبان بھی ایک انسانی عمل یا سعی ہے۔ اس کے دو رخ ہیں ایک طرف تو یہ عمل اس شخص کی طرف سے ہے جو اپنے دل کی بات دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اس شخص کی جانب سے ہے جو دوسرے کے دل کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

زبان کی تعریف اخذ کرنے کے لیے جب ہم ماہرین لسانیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں قدرے بہتر اور موزوں صورت حال نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں محمد حسین آزاد کا ماننا ہے کہ زبان اظہار کا وسیلہ ہے جو متواتر آوازوں کے سلسلے میں ظاہر ہوتا ہے۔ جنھیں تقریر یا سلسلہ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔ اسی بات کو انھوں نے ایک شاعرانہ لطیفے میں بیان کیا ہے کہ زبان اور بیان یعنی تحریری اور غیر تحریری عبارت ہوائی سواریوں کی طرح ہیں جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں اور کانوں کے راستے سامعین یا مخاطبین کے دماغوں میں پہنچتے ہیں۔ اس سے رنگین تر مضمون یہ ہے کہ جس طرح تصویر اور تحریر قلم کی دستکاری ہے جو آنکھوں سے نظر آتی ہے، اسی طرح تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر ہے جو آواز کے قلم نے ہوا پر کھینچی ہوتی ہے۔ وہ صورت، ماجرا، کام، مقام اور ساری حالت کانوں سے دکھاتی ہے۔

آزاد نے بڑے دلچسپ انداز میں زبان کے تقریباً ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جو لسانیاتی علماء کے یہاں اب تک اہم موضوعات میں شامل ہے مثلاً متواتر آوازوں کے سلسلے، صوتی اور نطقی یا سمعی کے ساتھ تفہیم کا عنصر، خیالات و جذبات کی ترسیل تک محدود کر دینے کی بجائے صورت ماجرہ، کام، مقام اور ساری حالت تک زبان کے منصب کو پھیلا دیا ہے۔ دتاتریہ کیفی بھی ابتدائی ماہرین لسانیات کی مانند زبان کو تخیل اور خیال

کے ادا کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ زبان کے متعلق یہ نظریہ ایک عرصے تک کافی سمجھا گیا لیکن اس میں نہ تو زبان کو ایک نظام قرار دیا گیا اور نہ علامات کا سلسلہ۔ یہ ایک ناقص اور ابتدائی تعریف ہے جو زبان کے ضمن میں ہمیں ملتی ہیں۔

محی الدین قادری کے یہاں زبان کے سلسلہ میں اس طرح کے خیالات ملتے ہیں کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔ یعنی عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا محرک انسانی خیالات اور جذبات کو قرار دیتے ہوئے زبان کی آلاتی، منطقی اور اختیاراتی پہلو کا ذکر تو کیا گیا ہے مگر زبان کی علامتی حیثیت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ گیان چند جین قدرے بہتر انداز میں زبان کی تعریف کرتے ہوئے اسے ارادتاً اور من مانا صوتی علامات کا قابل تجزیہ نظام قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ زبان بالقصد من مانی، قابل تجزیہ، صوتی علامات کا وہ نظام ہے جس کے ذریعہ ایک انسانی گروہ کے افراد اپنے خیالات کی ترسیل باہمی کرتے ہیں۔

مذکورہ دانشوروں کے علاوہ برج موہن دتاتریہ کیفی کا کہنا ہے کہ زبان، تخیل اور خیال کے ظاہر کرنے یا مطلب ادا کرنے کا ذریعہ ہے۔ زبان کا تعلق ناطقہ کے ذریعہ اظہار خیال کرنے سے ہے اور ناطقہ کا تعلق آواز سے ہے۔

مغرب میں لسانیات پر تحقیق و تدقیق کی تاریخ خاصی قدیم ہے۔ عہد یونان سے عہد حاضر تک اس موضوع پر موجود تحریریں مسلسل ارتقاء کی مظہر ہیں۔ یونانی فلاسفر ڈیموکریٹس نے الفاظ کو انسان کی ہیجانی آواز قرار دیا۔ بعد ازاں ایک طویل عرصہ تک مغربی فلاسفہ، ادیب اور نقاد اس نظریے کے پرچارک رہے۔ انھوں نے زبان کا ناطہ انسانی جذبات اور احساسات کے ساتھ جوڑے رکھا۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں ہے:

> The soft in the mouth that moves around, used for tasting, swallowing, speaking etc.(Oxford Advance Learners, Dictionary, London, Oxford University press 1993, pg1617)

عہد حاضر میں مغرب میں لسانیات کو ایک سائنس کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ مختلف مغربی لسانی علماء کے یہاں 'زبان' کی تعریف کے لیے متنوع اسلوب و خیالات ملتے ہیں۔ ان میں سے چند اہم لسانیاتی ماہرین کے نزدیک کی گئی زبان کی تعریف کا جائزہ لیں تو ڈی اے کروز (D.A. Crose) زبان کی تعریف کرتے ہوئے اسے مروجہ علامات کا ایک نظام قرار دیتا ہے جو مفہوم کے خود مختیارانہ ابلاغ کے عمل کے لیے مستعمل ہو۔ کروز علامات کے نظام میں ساختیاتی صوتیات (Structural Phonology) کی بات کرتا ہے۔ یہ ایک نئی اصطلاح ہے جو آج کے دور میں لسانی ماہرین بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مراد یہ کہ زبان کی علامات اصوات سے متشکل ہیں جو انتہائی پیچیدہ ساخت میں منظم ہوتی ہیں۔ ماہر لسانیات ساپر (Sapir) کے درج ذیل الفاظ ملاحظہ کیجیے:

> ’’A purely human and non-instinctive method of communicating ideas, emotions and desires by means of a system of voluntarily produced symbols. (These symbols are...auditoryand...produced by the organs of speach)

ساپر کے نزدیک خیالات، جذبات اور خواہشات کے ابلاغ کا ایک خالصتاً انسانی (غیر حیوانی) طریقہ، ایک ایسے نظام کے ذریعے جو رضا کارانہ طور پر علامات پیدا کرتا ہے۔ (یہ علامات سماعتی ہوتی ہیں اور تکلمی اعضاء کی پیدا کردہ ہوتی ہیں)۔ ساپر نے انسان اور حیوان کے درمیان زبان کے تفاوت کو تسلیم کرتے ہوئے زبان کو علامات کا ایک نظام قرار دیا ہے، جس میں علامات رضا کارانہ اور از خود پیدا ہوتی ہیں۔

جان پی ہیوز نے تقریباً سا پر کے الفاظ میں تعریف کی ہے مگر یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ انسان سے دوسرے انسان تک سوچ کی ترسیل ہے جبکہ دیگر ماہرین لسانیات کے یہاں اس طرح کی توضیح دیکھنے میں نہیں آتی، عموماً لفظ ابلاغ استعمال کیا گیا ہے۔ترسیل کا مطلب فقط بھیجنا ہے یا ادا کر دینا ہے۔اس میں دوسرے انسان کی تفہیم کی صلاحیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، جبکہ ابلاغ کا مطلب عموماً سامع کے سمجھنے سے ہوتا ہے۔

آر اے ہال (R.A.Hall) نے چند لفظوں کے ردوبدل اور اضافے کے ساتھ تقریباً یہی تعریف کی ہے اور اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ انسان دیگر عادات کی طرح زبان سیکھتا ہے۔ہم غیر شعوری طور پر بہت کچھ ایسا بول جاتے ہیں جو ہم سوچتے نہیں ہیں۔اس نے زبان کو تکلمی و سمعی متعین علامات کا مجموعہ کہا ہے یعنی ایسی صوتی علامات جو بھیجنے سے وصول کرنے والے تک رابطے اور ابلاغ کے عمل کے دوران پہنچتی ہیں۔ جان پی ہیوز (John.P.Hughs) مختلف تعریفوں پر عدم اطمینان ظاہر کرتے ہوئے نیز چند ماہرین لسانیات کی آراء کے بعد ایک نہایت مختصر اور جامع تعریف پیش کرتا ہے۔

> A system of arbitrary symbols by which thought is coveyed from one human being to another.

جان پی ہیوز کے نزدیک زبان' متعین نطقی علامات کا ایک نظام ہے جس کے ذریعے ایک انسان سے دوسرے انسان تک خیالات کی ترسیل ہوتی ہے۔جبکہ معروف امریکی ماہر لسانیات نوم چومسکی (Noam Chomsky) کا خیال ہے کہ:

> "I will consider a language to be a set (finite or infinite) of sentences, ezch finite in lenght and constructed out of a finite set of elements."

نوم چومسکی زبان کو جملوں کا ایک مجموعہ خواہ وہ 'متناہی ہو یا لا متناہی' قرار دیتا ہے، جس میں ہر لا متناہی کی طوالت اور تشکیل متناہی مجموعہ عناصر سے ہوتی ہے۔نوم چومسکی عالمی سطح پر ایک فطرتی، آفاقی قواعد زبان کے نظریہ کے داعی ہیں، یقیناً انھوں نے زبان کی تعریف کرتے ہوئے اس امر کو مدنظر رکھا ہوگا کہ یہ ایک آفاقی تعریف ہو جو دنیا کی تمام زبانوں پر صادق آتی ہو۔دیگر لسانی علماء کے برعکس نوم چومسکی نے زبان کے عمل ابلاغ اور صوتی عناصر کی علامتی فطرت یا تسلسل کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا بلکہ تمام تر توجہ زبان کے ساختیاتی وصف پر مرکوز رکھی۔

کسی بھی زبان کا سائنسی طرز پر مطالعہ 'لسانیات' کہلاتا ہے، اس لیے جب ہم کسی بھی زبان کی اصوات، اس کی صرف ونحو، معنیات، اس کے خاندان اور ذیلی خاندانوں کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو یہ تمام مباحث لسانیات کی ذیل میں ہی آئیں گے۔انسان حیوان ناطق ہے اور اسی نطق کی بنیاد پر یہ اشرف المخلوقات کہلایا۔جس طرح منطق علم بھی ہے اور فن بھی، اسی طرح زبان کے بھی دو پہلو ہیں۔ایک بولنا اور دوسرا فصاحت وبلاغت سے بولنا اور ہر بولنے والا زبان کے اصول سے واقف نہیں ہوتا۔جیسے کاریگر اور مزدور دونوں کا عمارت سازی سے واسطہ تو ہے لیکن دونوں کے کام الگ الگ حیثیت کے حامل ہیں۔

لسانیات Linguistics ایک ایسا علم ہے جس میں انسانی زبانوں، ان کی موجودہ صورت اور زبانوں میں مرور ایام کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس علم میں مختلف زبانوں کی آپس میں مشابہت کے ساتھ ساتھ اس چیز کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے کہ زبانوں کا اس دنیا کی دیگر چیزوں کے ساتھ کیا رابطہ ورشتہ ہے۔علم لسانیات کے ذریعہ ہم زبان کی ماہیت، تشکیل اور اس کے عروج وارتقاء کے متعلق آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ان میں اصوات، خیالات، سماجی صورت حال اور معنی وغیرہ شامل ہیں۔گویا لسانیات وہ علم ہے جس میں صرف انسانی زبان پر بحث کی

جاتی ہے۔ یہ علم زبان کی تاریخ اور تشکیل کو موضوع گفتگو بناتا ہے۔ بالفاظ دیگر لسانیات میں زبان کا عمومی اور نظریاتی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے جس کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان کیا ہے، زبان کا نظام اور اس کے اجزائے ترکیبی کس طرح کام کرتے ہیں اور ان کا باہمی ربط وعمل کیا ہے۔ اس نظریاتی مطالعے کا مقصد زبان کی مختلف سطحوں مثلاً صوتیاتی، صرفی، نحوی اور معنیات کے بارے میں کلی قواعد واصول وضع کرنا ہے۔ جن کا اطلاق دنیا کی زیادہ سے زیادہ زبانوں پر ہو سکے۔ جدید ماہرین لسانیات عہد حاضر کی لسانیاتی تحقیقات کی روشنی میں اب از سر نو زبان کے حقائق ومعارف کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے لسانیات کی وسعت اور مقبولیت میں تیزی سے ترقی ہو رہی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سائنسی طریقے سے زبان کا مطالعہ لسانیات کہلاتا ہے۔

لسانیات کا سب سے نزدیک رشتہ مروجہ قواعد سے ہے لیکن دونوں یکساں نہیں۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ لسانیات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ صرف ونحو اس کے محض دو شعبے ہیں ان شعبوں اور مروجہ قواعد میں بھی فرق ہے۔ قواعد کسی ایک زبان سے متعلق ہوتی ہے لیکن صرف ونحو کے اصول عام طور سے کئی زبانوں پر چسپاں کیے جاسکتے ہیں۔ مروجہ قواعد زبان کی فصیح شکل کا مطالعہ کرتی ہے۔ ادب سے لسانیات کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ شرح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لسانیات سے قدیم ادب کو اور دوسری زبانوں سے مستعار لفظوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ زبان صرف ایک عام نظام نہیں جس کے مطابق جملوں کی تشکیل ہوتی ہے بلکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر جملوں کی تشکیل کے قواعد کا علم بھی مضمر ہوتا ہے جب زبان کو گفتار سے جدا کیا جاتا ہے۔ پس زبان کا ایک جامع تجریدی نظام ہے اور گفتار اس کی محدود انفرادی شکل ہے جو بولنے والے کے نطق میں ظاہر ہوتی ہے۔ زبان کی خوبی یہ ہے کہ اسے انسان خود اختیار کرتا ہے۔ جب کوئی بھی آواز نکلتی ہے تو اس سے بننے والی شکل کا اس کے معنی کے ساتھ فطری یا منطقی طور پر کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی قدیم ترین بولی جانے والی زبانوں مثلاً عبرانی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت کو آج بھی زبانوں کا منبع کہا جاتا ہے۔ ان تمام زبانوں کی ہی ترقی یافتہ زبانیں دنیا میں رائج ہیں۔ اگر آواز کے فطری یا منطقی معنی میں کوئی فرق نہ ہوتا تو آج پوری دنیا میں ایک ہی زبان کا سکہ چلتا۔

علم لسانیات الفاظ اور معنی میں ہونے والی تبدیلی کو کہتے ہیں۔ تاریخ عالم کے شروع میں انسان کی ایک زبان تھی، پھر بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آتی گئی جیسا کہ موجودہ دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ڈھائی کوس کے فاصلے پر زبان میں تھوڑا بہت فرق ضرور دکھائی دیتا ہے۔ روز اول سے ہی بشر کے امور زبان کے بغیر ناممکن تھے۔ اگر چہ لسانی مورخین کا موقف اس سے مختلف ہے اور زبان کو انسانی تہذیب وتمدن کی مانند ارتقائی اور خود اکتسابی قرار دیتے ہیں۔ جدید ترین معاشرتی زندگی کے حصول تک انسان نے اظہار کے لیے جس چیز پر سب سے زیادہ انحصار کیا وہ زبان ہے اور انسانی زندگی کا اہم تلازمہ ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا معاشرہ یا قوم نہیں جہاں کے لوگ کوئی زبان نہ بولتے ہوں۔ زبان محض اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ کسی بھی تمدن کی انفرادیات اور خصوصیات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ زبان علامتوں اور آوازوں کا ایک ایسا نظام ہے جو انسانوں کے درمیان ابلاغ کا سبب ہوتا ہے اور جسے انسان اپنے خیالات دوسروں پر آشکار کرنے کے لیے ارادتاً نکالتا ہے اور ان آوازوں کے معنی متعین کر لیے جاتے ہیں تاکہ کہنے اور سننے والے کے یہاں تقریباً ایک ہی جذبات پیدا ہو۔ الفاظ ان ذہنی تصویروں کی ملفوظی علامات ہیں جنہیں ہم دوسروں کے ذہنوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

☆ 'زبان' انسان کی تکلمی یا نطقی آوازوں سے تشکیل پاتی ہے۔

☆ یہ ایک علامتی حیثیت رکھتی ہے۔

☆زبان اختیاری اور متفقہ علیہ ہوتی ہے۔

☆یہ ایک منضبط نظام ہے۔

☆زبان ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے۔

زبان کی پانچوں مذکورہ خصوصیات اس لیے آفاقی حیثیت رکھتی ہیں کہ دنیا کی ہر زبان پر منطبق کی جاسکتی ہیں۔ بلاشبہ زبان ایک ایسا تاریخی تصور ہے جو قدیم زمانے سے انسان کے ابلاغ تکلم کے لیے وضع کیا گیا اور یہ زبان علامات کا ایک ایسا نظام بناتا ہے جو انسان کی تکلمی یا نطقی آوازوں سے تشکیل پاتا ہے جو اختیاری اور متفقہ علیہ ہوتا ہے اور ابلاغ کا بھی کام کرتا ہے۔

13.2.1 لسانیات کی شاخیں

لسانیات کی مندرجہ ذیل شاخیں ہیں:

صوتیات(Phonetics)

صوتیات میں کسی زبان کی کل اصوات کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ اصوات کیسے پیدا ہوتی ہیں اور ان اصوات کی درجہ بندی کس طرح کی جاسکتی ہے۔ ہر زبان صوتی ہوتی ہے، انسان کو اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے اس کا وسیلہ لینا پڑتا ہے۔ ہر انسان کے جسم کے بالائی حصہ میں اعضا و تکلم ہوتے ہیں یا آواز عضوی فعلیات کا ایک واقعہ ہوتا ہے، جس کے بغیر زبان کا تصور محال ہے۔ ہر زبان میں محدود اور مخصوص اصوات کا استعمال کیا جاتا ہے۔

فونیمیات(Phone-mics)

اس میں ان طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن سے کسی زبان کی تخالفی اور امتیازی اصوات کی اکائیوں کو معلوم کیا جاتا ہے۔فونیم سے امتیازی آوازوں کی وہ تعداد مراد ہے جس کی بھی زبان میں محدود ہوتی ہے۔

صرفیات(Morphology)

مارفولوجی میں کسی زبان میں موجود چھوٹی چھوٹی اکائیوں کا مطالعہ ہوتا ہے۔اصل میں یہ لفظ کی سطح تک زبان کا صرفی مطالعہ کہلاتا ہے۔

نحویات(Syntax)

علم نحو کسی زبان کے جملوں کی ساخت اور جملوں میں لفظوں کی ترتیب کے قاعدوں کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔

معنیات(Semantics)

اس میں ان طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن سے زبان میں معنی سمجھنا مقصود ہو۔اس میں لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔

تاریخی لسانیات:

لسانیات کے مطالعہ کی وہ قسم جس میں کسی زبان میں وقت کے ساتھ پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی پیش نظر رکھا جاتا ہے اور ان اصولوں کا جائزہ لیا جاتا ہے جن کی بنیاد پر یہ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

تقابلی لسانیات:

تقابلی لسانیات میں تاریخی اعتبار سے ہم رشتہ زبانوں کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے اور اس اصل زبان کی تلاش کی جاتی ہے جس سے یہ مختلف زبانیں الگ الگ ہوئی ہیں۔

تجزیاتی لسانیات:

یہ زبان کے ڈھانچے کو منکشف کرتی ہے۔ کسی لفظ یا آواز کے ماضی میں کیا روپ تھے، تجزیاتی لسانیات کو اس سے دلچسپی نہیں۔ اس میں صوتیات اور قواعد وغیرہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

زمانیاتی لسانیات:

اس میں اعداد و شمار کی مدد سے کسی زبان کی عمر کا تعین کیا جاتا ہے۔ لسانی زمانیات لغاتی اعدادیات کی سب سے اہم شاخ ہے۔

لسانی عتیقیات:

اس میں قدیم زبانوں کی مدد سے قدیم تہذیبوں اور قبل تاریخ عصر کی تاریخ معلوم کی جاتی ہے۔ یہ اطلاقی لسانیات کی شاخ ہے۔

لغت:

ماہرین ساختیات نے معنیاتی توضیح کے سلسلے کی قلیل ترین اکائی کو لغت کہا ہے، جن کی مفصل فہرست ڈکشنری کہلاتی ہے۔

تدوین اللغات:

اس میں کسی زبان بالخصوص بچھڑی ہوئی زبان کے لغت بنانے کے اصول طے کیے جاتے ہیں۔

ساختیات:

لسانی ساخت کے تجزیاتی مطالعے کا نام ساختیات ہے۔ اس میں مطالعے کی کئی سطحیں ہیں مثلاً صوتی تشکیلیات یا صرفی، نحوی، معنیاتی اور اسلوبیاتی۔ جدید توضیحی لسانیات انہی پر مشتمل ہے زبان کی صوتی سطح کا تجزیاتی مطالعہ فونیمیات کا موضوع ہے۔ صرفی اور نحوی سطحوں پر ساختیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے۔

3.2.2 علم لسانیات کے اجزا

لسانیات اجزا درج ذیل ہیں:

صوتیہ:

کسی بھی آواز کی چھوٹی سی چھوٹی اکائی صوتیہ کہلاتی ہے۔

صورت رکن:

زبان کی ادائیگی کے وقت سانس کی ہوا ایک دم سے باہر نہیں نکلتی، بلکہ زبان کی آوازوں کے ٹکڑے اور سانس کی ہوا کا اخراج دونوں میں ایک ربط رہتا ہے۔ صوتی اعتبار سے زبان کی ادائیگی کے وقت اصوات گروپ میں تقسیم ہو جاتی ہیں جن کو تنفّسی گروہ کہتے ہیں۔ یہ گروہ صورت رکن کہلاتا ہے۔ کسی بھی تقریر کو صوت رکن میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مصوتے:

یہ وہ آوازیں ہیں جن میں آواز کے اعضا گونج کے خلا بناتے ہیں اور جن میں سے سانس کی ہوا بغیر کسی رگڑ کے گزر جاتی ہے۔

مصمتے:

یہ وہ آوازیں ہیں جن میں سانس کی ہوا کو اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ ملتی ہے جس سے رگڑ پیدا ہوتی ہے۔

بل:

تنفّسی بہاؤ میں وہ زور ہے جس سے ایک صوت رکن دوسرے صوت رکن کے مقابلہ میں زیادہ زور سے بولا جاتا ہے۔عموماً ہر اس لفظ میں جس میں دو یا دو سے زیادہ صوت رکن ہوں گے اس میں سے ایک صوت رکن دوسرے کے مقابلے میں زیادہ زور سے بولا جائے گا۔

لہر:

ایک ہی یا جملے کو کئی طرح سے ادا کیا جا سکتا ہے، جس سے بولنے والا مختلف جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ لہجے کا یہ اتار چڑھاؤ حلق سے نکلنے والے سُر کو بدلنے سے پیدا ہوتا ہے، جس کو لہر کہتے ہیں۔

سُر:

بعض زبانوں میں سُر کے اتار چڑھاؤ سے لفظی معنوں میں تبدیلی کی جاتی ہے، ان کو سُر کہتے ہیں۔

مارفیم یا صرفیے:

ماہرین ساختیات چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو 'مارفیم' کہتے ہیں۔ یہ متن یا مواد کی نمائندگی کرتی ہے۔

ساق:

لفظ کا وہ حصہ ہے جس میں تصریفی مارفیم جوڑے جا سکیں 'ساق' کہلاتا ہے۔

13.3.3 زبان کا منصب

ابتدائے آفرینش سے انسان زبان کو وسیلۂ اظہار کے طور پر استعمال کرتا آیا ہے۔ زبان کی انفرادیت یہ ہے کہ سوچ کے دائرے میں آنے والی ہر شے کا عملی اظہار کر سکے۔ انسان کبھی بھی اپنے اندر پائی جانے والی پیچیدگی تک رسائی حاصل نہ کر پاتا اگر زبان اس عمل کا وسیلہ نہ بنتی، یعنی زبان ہی میں ہم سوچتے ہیں، البتہ باہم رابطہ اور ابلاغ و ترسیل کا پہلا اور بنیادی منصب زبان ہے کیونکہ زبان باہم رابطے کے لیے پہلے متشکل ہوئی اور بعد ازاں ذاتی غور و فکر کے لیے کام میں لائی گئی۔ زبان کا تعلق انسانی یادداشت سے ہے کہ انسان کے ذہن میں محفوظ تمام تر علمی، معاشی، سیاسی، سماجی تجربات اور خیالات دراصل کسی نہ کسی زبان میں الفاظ کی اکائیوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں، جن کا بوقت ضرورت انسان استعمال کرتا ہے۔ گویا زبان' خیالات کا ذریعہ ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ وہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔ الغرض انسان نظام کائنات کی پیچیدگیوں اور انسانی نفسیات کی بوالعجبیوں کا ادراک کسی نہ کسی زبان میں غور و فکر کے بعد حاصل کرتا ہے۔ روزمرہ امور میں زبان صرف وسیلۂ اظہار و ابلاغ نہیں ہے بلکہ شب و روز کے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور علمی مسائل پر تدبر کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی طرح انسان اپنے جذبات و ہیجانات اور احساسات کا اظہار زبان میں کرتا ہے اور طنز و مزاح یا دیگر تکلمی ذرائع سے سامان نشاط کا اہتمام بھی کرتا ہے۔

3.2.4 بولیوں کا علم (Dialectology)

اس علم میں زبان کا مطالعہ کر کے دیکھا جاتا ہے کہ ایک زبان میں کسی خاص زمانے میں مختلف مقامات پر کیوں فرق پیدا ہوتا ہے اور ایک ہی زبان میں علاقے کے فرق کے ساتھ کیسی تبدیلی ہوتی ہے۔'زبان' کی اصطلاح جن معنوں میں سمجھی جاتی ہے تقریباً وہی مفہوم 'بولی' سے لیا جاتا ہے۔ ماہرین لسانیات نے انگریزی زبان کی اصطلاح (Dialect) سے آگہی کے بعد 'بولی' کا الگ سے مفہوم سمجھنا شروع کر دیا۔ بولی کیا ہے اس کی حتمی تعریف کرنا آسان نہیں، کیونکہ ایسی کوئی تعریف پیش کرنا جو زبان پر صادق نہ آئے بہت مشکل ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں 'بولی' (Dialect) کے ضمن میں ایک سادہ بات انتہائی پیچیدہ کر کے بیان کی گئی ہے کہ یہ چھوٹے لسانی گروہوں میں قابل شناخت مختلف اقسام کی زبانیں ہیں جو بولیوں کہلاتی ہیں۔ یہ باہمی ابلاغ کو بھی ناممکن نہیں بناتیں۔ ایک لسانی گروہ میں مختلف بولیاں ہوسکتی ہیں، جو اس لسانی گروہ کے افراد کے مابین ابلاغ کا مسئلہ بنائے بغیر الگ الگ رہتی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا میں بولی کے تاریخی پس منظر کے بارے میں مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے کہ اس اصطلاح کی بنیادیں یورپی علاقوں، ثقافتوں اور نسلوں کے افتراق میں ہیں اور یہ اصطلاح عام طور پر زبان کے اندر افتراق کا حوالہ دینے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اکثر بولیوں کی خصوصیات میں مماثلت تو ہوسکتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ تمام بولیاں غیر معروف ہوں اور تمام زبانیں معروف اور اسی طرح زبانیں بھی غیر معیاری ہوسکتی ہیں اور بولیاں بھی معیاری اور مہذب کہ جس کا تعین کرنا ہرگز آسان نہیں۔ یہ بھی لازمی نہیں کہ بولی کا کوئی نام نہ ہو۔ بیشتر بولیاں اپنے نام کے سبب پہچانی جاتی ہیں۔ اور اسی طرح ہر بولی کا کہیں نہ کہیں لسانی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ آر ایچ رابنز (R.H. Robins) نے قدرے وضاحت سے بولی کی اصطلاح کے تین معنی بیان کیے ہیں:

(1)Fomrs of speech that are different butmutually intelligible without special training.
(2)The form of speech current within apolitically unified area and;
(3) Form of speech of speakers sharing a common writing system and set of writtin classics.

(۱) گفتگو کے لہجے جو مختلف ہیں مگر کسی خاص تربیت کے بنا آپس میں قابل فہم ہیں۔
(۲) گفتگو کے لہجے جو متحدہ سیاسی حدود میں جاری ہوں۔
(۳) مشترک رسم الخط اور کلاسیکی ادب کا مجموعہ رکھنے والے کے گفتگو کے لہجے۔

رابنز نے تین مختلف صورتحال بیان کر کے بولی اور زبان کے فرق کو کافی حد تک واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تین صورتوں میں ہم بولی کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں، یہاں بوی کی انفرادیت کے لیے لہجے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو سب سے موزوں ہے۔ معروف لسانی ماہر جان پی ہیوز (John P. Hughs) بولی کی تعریف زبان کے تناظر میں اس طرح کرتا ہے:

> "Language is, it will be remembered a system. On this basis we can say that, as long as we have variants of the same system, they are dialects, and we are not concerned with which one is or should be the prestige dialect of "Standered" when the system it self is different,we have a different language."

اس کے خیال میں زبان ایک نظام ہے، یہ ذہن میں رکھ کر اس کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک اس ایک نظام میں تغیر/اختلافات ہیں، بولیاں ہیں، اور ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ ان میں سے کون سی باوقار یا معیاری بولی ہے یا ہونی چاہیے، جب نظام تبدیل ہو جائے تب ایک الگ زبان ہوگی۔

13.2.5 زبان کی اقسام

لفظ 'زبان' بنیادی طور پر نامکمل اور غیر تکنیکی اصطلاح ہے، یہ از خود کچھ بھی نہیں ہے، یہ ہر لحہ کسی نہ کسی قسم کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ ماہرین لسانیات زبان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے عموماً زبان کو اس کی کسی قسم کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے ہیں۔

(1) مادری زبان:

زبان ایک موروثی سماجی عمل ہے۔ انسان دنیا میں جنم لینے کے بعد ایک مربوط معاشرتی نظام کا حصہ بن جاتا ہے، جہاں سب سے پہلے وہ ان افراد کے اشاروں کو سمجھنے اور زبان سے ادا کیے گئے الفاظ کو دہرانے کا عمل کرتے ہوئے آخر کار محدود حد تک ایک زبان سمجھنے اور بولنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ گویا زبان کی تشکیل اور اس کا ارتقاء معاشرتی اور تہذیبی عوامل پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک معاشرتی عمل ہونے کے ناطے بچہ سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اپنی زبان سیکھتا ہے جو اس کے ماحول کی عام زبان ہوتی ہے۔ نینی جے کیب (Nany J. Cabb) بچے کی پیدائش سے تین سال کی عمر تک پہلی زبان سیکھنے کے عمل کو تین مراحل میں جامعت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ یہ ابتدائی زبان سیکھنے کا اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ بچے کی زبان سیکھنے کے عمل کو 'فطری' اور تربیتی سمجھا جاتا ہے۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystle) ابتدائی زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "TheLanguage first acquired by the child (also called the mother tongue native language) or preffared in a multiligual situation."
> (An Incyclopedic Ditionary of langguage, David Crystal,1992, P.138)

(جو زبان بچہ سب سے پہلے سیکھتا ہے (جسے مادری یا دیسی زبان بھی کہا جاتا ہے) یا جسے کثیر اللسانی صورت حال میں ترجیح دی جائے)

مذکورہ بالا تعریفوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی زبان کا تصور اس طرح بنتا ہے کہ بچہ ابتداء سے ہی جن آوازوں کو سنتا ہے یا توجہ پاتا ہے، اس کی پرورش کرنے والوں کی زبان اس کی ابتدائی زبان ہوتی ہے۔ اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) ابتدائی زبان نہ سکھلائی جاتی ہے اور نہ ہی سیکھی جاتی ہے بلکہ یہ نسل در نسل منتقل ہونے کا سماجی عمل ہے جو واقع ہوتا ہے۔

(ii) بعض اوقات ابتدائی زبان بچے کی ماں کی زبان سے مختلف ہو سکتی ہے، اسلیے اسے مادری زبان کہنا درست نہیں۔

(iii) کثیر اللسانی صورت حال میں ابتدائی زبان کو ترجیح دی جاتی ہے۔

(iv) انسان ابتدائی زبان کو کثرت سے استعمال کرتا ہے اور اس زبان میں اپنا آپ کھل کر بیان کر سکتا ہے۔

(2) ثانوی زبان:

ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو صرا ایک زبان جاننے تک محدود رہتے ہیں اور کسی مقصد کے حصول کے لیے دوسری زبانوں سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانی تمدن کے ارتقاء کے دوران شاید اس وقت تک تو ایسا ممکن ہوگا جب کسی بھی ایک علاقے یا لسانی گروہ کے افراد اپنے گروہ تک محدود رہتے ہوں۔ لیکن اب جدید ترسیلی آلات کے ایجاد ہونے کے بعد انسانوں کے مابین فاصلے کم ہو چکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اپنی مادری زبان کے علاوہ ہر فرد دوسری زبانیں سیکھتا ہے، یہ دوسری زبانیں ثانوی زبان کہلاتی ہے۔

(i) ثانوی زبان سے مراد ایسی زبان ہے جو انسان اپنی مادری ابتدائی زبان کے بعد سیکھے۔

(ii) ثانوی زبان بعض ضرورتوں اور مقاصد کے لیے سیکھی جاتی ہے اور عصر حاضر میں دنیا کے بہت کم باشندے ایسے ہیں جو ثانوی زبان نہیں

سیکھتے اور اپنی مادری زبان تک ہی محدود رہ جاتے ہیں۔

(iii) ان ممالک میں ثانوی زبان سیکھنے کی ضرورت لازمی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جہاں ایک سے زائد زبانیں بولی جاتی ہوں اور دنیا کے بیشتر ممالک میں ایک سے زائد زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

مختلف اہل علم اور دانشوروں کی آراء سے نتائج مستنبط کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

- ☆ کوئی زبان موروثی نہیں ہوتی یعنی کسی مخصوص زبان کو بولنے کی صلاحیت والدین کی طرف سے اولاد کو منتقل نہیں ہوتی۔ یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ اہل زبان کا سا تلفظ اور بولنے پر عبور اس لسانی گروہ کے لیے ممکن ہے۔اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زبان ماحول کی دین ہوتی ہے، وراثت کی نہیں۔
- ☆ کسی نوزائیدہ بچے کو دنیا کی کسی بھی زبان والے گھرانے میں دے دیجئے تو بڑا ہو کر انہیں کی زبان بالکل اسی فطری لہجے میں بولنے لگے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مخصوص زبان تو درکنار نطق انسانی بھی وراثت میں نہیں ملتا۔اگر نومولود بچہ انسانی آبادی سے دور جنگل میں پرورش پائے تو وہ جانوروں کی طرح غوں غاں ہی کرے گا، جنگلوں سے ملنے والے گرگ اطفال(wolf boys) کی کئی مثالیں مشاہدے میں آئی ہیں۔
- ☆ زبان کا علم اکتساب نقل سے ہوتا ہے، جو بچے بچپن سے بہرے ہوتے ہیں وہ گونگے بھی رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ دوسروں کی نقل نہیں کر پاتے۔
- ☆ زبان سماجی شے ہے، اس کا استعمال سماج ہی میں ہو سکتا ہے۔ایک شخص اپنے لسانی گروہ سے زیادہ سے زیادہ عرصے کے لیے کٹ جائے تو بعض اوقات اپنی مادری زبان کی مہارت بھی کھو بیٹھتا ہے اور وہ جس نئے لسانی گروہ کے بیچ میں رہنے لگتا ہے رفتہ رفتہ اس کی زبان پر عبور حاصل کر لیتا ہے۔ہم سب اپنی مادری زبان پر سب سے زیادہ قدرت اس لیے رکھتے ہیں کہ ہم مادری زبان کے ماحول میں سب سے زیادہ وقت گزارتے ہیں۔بعض صورتوں میں اگر پورا معاشرہ نہ ہو تو کم از کم گھرانے کا ماحول تو ہوتا ہی ہے۔
- ☆ زبان ایک عادت ہے۔ہم بچپن میں اسے حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے بعد اسے عادت کے طور پر برتتے ہیں۔
- ☆ زبان میں طرح طرح کے اظہارات کی لامحدود گنجائش ہے۔ہم اس کی اکائیوں کی متنوع ترتیبوں سے لامحدود پیغامات کی ترسیل کر سکتے ہیں۔
- ☆ زبان تغیر پذیر ہوتی ہے۔دریا کی طرح اس میں کہیں ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ہاں تغیر کی رفتار کافی سست ہوتی ہے۔ایک فرد کو اپنی زندگی میں اس کے تغیر کا احساس نہیں ہوتا لیکن ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں کہ ایک زبان سے کئی زبانیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان زبانوں سے پھر نئی زبانیں۔ بظاہر نئی زبانوں کا یہ ظہور دراصل تبدیلی کا کرشمہ ہے۔کئی صدیوں میں ایک زبان اس قدر بدل جاتی ہے کہ ہم اسے دوسری زبان کہنے لگتے ہیں۔
- ☆ زبان کبھی مکمل نہیں ہوتی، اس کی تکمیل ہی اس کی موت ہے۔

13.2.6 زبان کے آغاز کے مختلف نظریات

تخلیقِ کائنات کے بعد دنیا میں جو انسان پہلے پہل آیا ہوگا جو ظاہر ہے کہ آدم علیہ السلام تھے۔انھوں نے اپنے خیالات واحساسات کے اظہار کے لیے یا تو اسی زبان کا استعمال کیا ہوگا جو وہ جنت میں بولتے رہے ہوں گے۔لیکن متذکرہ خیالات کی تردید کی صورت میں انہیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔اول اول انہیں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا آج کے دور میں تصور

کرنا بھی محال ہے، جہاں ایک کلک پر ساری دنیا کی معلومات آن واحد میں ہماری اسکرین پر ہوتی ہیں۔ بعض مغربی ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ انسان کے منہ سے نکلنے والا پہلا لفظ شاید 'ہائے' تھا۔ پروفیسر فولی کے مطابق دیانت داری سے اگر بات کی جائے تو ہمارے علم میں اس کا کوئی سراغ نہیں کہ انسان نے پہلے پہل کون سا لفظ بولا ہوگا۔ محض اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے تبادلۂ خیال کے لیے اشاروں کا سہارا لیا ہوگا، یا چہرے کی تبدیل ہوتی ہوئی کیفیت سے ان کے عمل اور ردعمل کا اندازہ لگالیا ہوگا۔ پھر آہستہ آہستہ مدتوں ایک ساتھ رہنے بسنے کے سبب وہ ایک دوسرے کی عادات، خوشی ورنج اور غصہ کی کیفیات سے آگاہ ہوگئے ہوں اور چہرے کی مختلف شکلوں اور ہاتھوں کے اشاروں سے تبادلۂ خیالات کرلیتے ہوں گے۔ پھر ان میں سے بعض لوگوں نے غیر شعوری طور پر اشیاء، موسم، حالت، کیفیت، خوشی اور رنج کی عکاسی کے لیے بعض نام گڑھ لیے ہوں گے، جو آپسی استعمال کے ساتھ ساتھ دوسرے قبیلوں اور بستیوں تک بھی پہنچے ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہوگا کہ ایک شے کے لیے جدا جدا بستی میں الگ الگ نام مستعمل ہوں۔ چنانچہ ان گڑھے ہوئے ناموں میں کثرتِ استعمال اور ایک مدت دراز تک استعمال ہوتے ہوتے کافی حد تک تغیر وتبدل بھی واقع ہوا ہوگا۔ اس طرح الفاظ کی شکلیں بنتی بگڑتی رہی ہوں گی اور رفتہ رفتہ' ایک ہی خطہ میں سہی ان تشکیل شدہ الفاظ پر اتفاق رائے ہوگیا ہوگا۔ گویا الگ الگ خطوں میں اشیاء کے الگ الگ ناموں کی تشکیل ہی کئی زبانوں کے وجود کی بنیاد بنی، یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات نے ایک محتاط اندازے کے مطابق زبانوں کی تعداد 5000 سے 7000 بتائی ہے اور ان میں مشہور زبانوں کی تعداد قیاساً دو ہزار سات سو چھیانوے (2796) بتائی جاتی ہے۔ ان زبانوں کے علاقوں اور وجود میں آنے کے اسباب کا تعین کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ ان زبانوں میں زیادہ تر زبانیں نسل انسانی کے ساتھ ہی وجود میں آئی اور ان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی نوع انسان کی۔

ماہرین لسانیات کے نزدیک آغاز زبان کا مسئلہ ہمیشہ سے متنازعہ فیہ رہا ہے۔ اس ضمن میں متعدد نظریات منظر عام پر آتے ہیں مثلاً اختراعی نظریہ، جس کی رو سے زبان انسان کا تخلیقی عمل ہے۔ حادثاتی یا اتفاقی نظریہ کی رو سے زبان کے آغاز کو محض ایک اتفاق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے ماہرین لسانیات کا ماننا ہے کہ زبان کا آغاز ''مادے'' (Roots) سے ہوا ہے۔ وٹنے نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مختلف لسانی گروہوں کی ان گنت بولیوں کے دستاویزی حقائق اور شواہد کے محتاط استقراء سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ ڈبلیو ایچ جے بلیک کے نزدیک انسان نے پہلے پہل احساسات وخیالات کے اظہار کے لیے مخصوص صوتی اشارے ادا کیے، جنہیں ان کے دوسرے ہم جنسوں نے ان سے نقل کر کے ادا کیے اور رفتہ رفتہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بعض نظریات کی رو سے زبان کی ابتدا انسان نے کتے کے بھونکنے، بکری کے ممیانے اور بعض دوسرے جانوروں کی مخصوص آوازوں کی نقالی سے سیکھی اور اس طرح ابتدائی فطری کلمات وجود میں آئے۔ جبکہ بعض نظریات کی رو سے زبان ان جذباتی اصوات سے اخذ ہوئی ہے جو شدتِ احساس یا درد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

جرمن ماہر لسانیات اور نفسیات G. Revesz نے زبان کی ابتدا کے مذکورہ بالا تمام نظریات کو دو حصوں میں منقسم کر کے زبان کی ابتدا کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ (1) حیاتیاتی نظریات (2) بشریاتی نظریات۔ اس نے حیاتیاتی نظریات کے تحت دلالت وضع کرنے والے اشارات و حرکات اور جانوروں کی آوازوں سے متعلق لسانی نظریوں سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بعض حرکات واشارات اور اصورات میں اظہاریت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرین لسانیات انھیں حرکات، اشارات اور اصوات کو زبان کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ ایسے اشارے بنیادی طور پر حیاتیاتی ہی ہوتے ہیں۔ اس نے حیوانی آوازوں کی نقالی کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جس قسم کی آوازیں جانور نکالتے

رہتے ہیں کم وبیش اسی قسم کی آوازیں انسان کو بھی ودیعت کی گئی ہیں۔ پھران آوازوں سے کام لینے کے لیے خارجی نمونوں کی کیا ضرورت تھی؟

اس نے بشریاتی نظریات کے ذیل میں فطرتی اصوات کی نقالی کے نظریے جیسے، بچوں کی غوں غاں، بچکانی زبان، غنائی آوازوں یا گیتوں کے تقدم کے نظریات، نفسیاتی رجحان کے نظریات، اشارتی نظریات،، زبان کے انسانی عناصر اور خامیوں کے نظریات سے بحث کی ہے۔

زبان کے آغاز کے فلسفیانہ نظریات کو دو گروہوں میں منقسم کر کے زبان کے آغاز کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (1) خلقیت پسندانہ اور (2) تجربیت پسندانہ۔ اول الذکر کی رو سے انسان کی نطقی استعداد ودیعت کردہ ہے یعنی پیدائش سے ہی اسے اصوات عطا کیے گئے ہیں اور اس استعداد کے ذریعہ وہ خود بخود بولنا شروع کر دیتا ہے۔ موخر الذکر نظریہ کی رو سے زبان کے آغاز کے سلسلے میں تجربے، قوت ارادی، اور فکر خصوصاً قیاس تمثیلی کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ نظریۂ ارتقا کے زیر اثر زبان کے آغاز کے تولیدی نظریات سامنے آئے جن کی رو سے زبان کی ابتدائی صورتوں کی تشکیل نو اور بچوں اور جانوروں کی نفسیات سے اخذ کردہ مواد کی مدد سے مفقود لسانی کڑیوں کی فراہمی پر خصوصی توجہ دی گئی۔

اصوات کو الفاظ میں بدلنے کا مسئلہ کافی پیچیدہ رہا ہوگا۔ لیکن اتنا طے ہے کہ انسان کی زبان ابتدائی طور پر نشانات پر مشتمل تھی اور اس ضمن میں چینی اور اسی قبیل کی دیگر زبانیں آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں جو حروف کی بجائے اشکال پر مشتمل دکھائی دیتی ہیں۔ انسان نے اپنی ترقی کے ساتھ ساتھ نشانیاتی شکلوں کو بھی ترقی دی اور انہیں حروف کا جامہ پہنایا۔ پھر ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ زبان کے وجود میں آجانے کے بعد اسے کس نام سے موسوم کیا گیا ہوگا یعنی اولین زبان کون سی تھی، جسے ہم ام الالسنہ یعنی زبانوں کی ماں کہہ سکیں؟ اس وقت ایک ہی زبان رائج تھی یا زمانۂ قدیم میں کئی زبانوں کا وجود ایک ساتھ عمل میں آیا؟ اس سلسلے میں جیکب بوہمے کا خیال ہے کہ ابتدا میں ایک زبان وجود میں آئی جسے ''لنگوا آدمیکا'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک اولین انسان نے ابلاغ کی غرض سے جس صوتی تسلسل کو استعمال کیا وہی ''لنگوا آدمیکا'' کہلائی۔ پھر اس سے شاخ در شاخ زبانوں کے سلسلے پیدا ہوتے گئے۔ ام الالسنہ (سب سے پہلی زبان) کا اس قسم کا تصور بہت سے مذہبی عالموں میں عام رہا اور مختلف ادوار میں عبرانی، عربی، سنسکرت وغیرہ کو ام الالسنہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ کسی ایک زبان کو تمام انسانی زبانوں کا ماخذ اور سرچشمہ قرار دینے کا یہ رجحان لسانیات کے فروغ پانے سے پہلے ہی نظر آتا ہے۔

زبانوں کے خاندان:

عالمی زبانوں کے خاندان:

تقابلی اور تاریخی لسانیات نے عالمی سطح پر بولی جانے والی زبانوں کو درج ذیل چند خاندانوں میں منقسم کیا ہے:

(1) ہند یورپی یا انڈو یورپی

(2) سامی یا سیمٹیک

(3) فنو یوگرک

مذکورہ خاندانوں میں فنو یوگرک خاندان سے متعلقہ زبانیں یوروپ کے قرب وجوار میں بولی جاتی ہیں نیز سوویت دیس کی بعض زبانیں اس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ مویدک زبانیں اسی خاندان کی زبانوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے فنو یوگرک اور سامویدک خاندانوں کو ایک مشترکہ نام یاورالک سے بھی جانا جاتا ہے۔ فنو یوگرک زبانوں کا علاقہ زیادہ وسیع نہیں ہے اور اس سے متعلقہ زبانوں کی تعداد بھی

بہت کم ہے۔البتہ ہند یور پی اور سامی خاندانوں کی زبانوں بہت قدیم تحریری نمونے دستیاب ہیں۔عصر حاضر میں اسرائیل کی نئی مملکت کے سبب ان زبانوں کی تجدید ہوچکی ہے۔اس خاندان کی دوسری اہم زبانوں میں عربی اور حبشی شامل ہیں۔ان کے علاوہ ایک اور بڑا عالمی خاندان حامی یا یمٹیک سے اس خاندان کی زبانیں کافی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔حامی زبانوں کا وہ قدیم خاندان ہے جس میں قدیم مصری قبطی یعنی کوٹپک اور بر بری قبائل کی پر یوز بانیں شامل ہیں۔جب ہم ہند یور پی زبانوں کی درجہ بندی کرتے ہیں تو درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

(1) آرمینی-اس کا تعلق دو ہزار سال قبل مسیح سے ہے۔

(2) ہند ایرانی-یہ دو ہزار سال قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے،جس میں قدیم وجدید فارسی کے ساتھ افغانستان اور بعض روسی زبانیں شامل ہیں۔

(3) ہند آریائی-1500 قبل مسیح،اس میں سنسکرت،پراکرت،اپ بھرنش مشرقی اور مغربی ہندی نیز تمام جدید آریائی زبانیں شامل ہیں۔

ہندوستانی زبانوں کے خاندان:

آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں کے بارے میں خاطر خواہ مواد دستیاب نہیں ہے البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل ہندوستان میں نگریٹو (Negretos) خاندان کا پتا چلتا ہے جو فلسطین سے آئے تھے اور ہندوستان کے علاوہ سیلون، برما اور آسٹریلیا کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ملایا،سماترا اور فلپائن کے بعض جزیروں میں آج بھی ان کے بعض آثار نظر آتے ہیں۔ہندوستان کے لسانی سرمایے میں کہیں بھی ان کی زبان سے متعلق کوئی ثبوت نہیں ہے۔

زبانوں کا آسٹرک خاندان:

نگریٹو کے علاوہ ہندوستان آنے والوں میں ایک اور نسل کا پتا چلتا ہے جو آسٹرک (Austric) یا پروٹو آسٹرلائڈ کہلاتے تھے۔انھوں نے بول چال کی جو زبان استعمال کی وہ اسی نسل کے نام پر آسٹرک کہلائی۔ان کی زبان کی بعض شاخیں ملایا،انڈونیشیا،ہند چینی اور مان کھمیر وغیرہ علاقوں میں بھی پہنچی اور خیالات واحساسات کے اظہار کا ذریعہ قرار پائیں۔ہندوستان میں آج بھی خصوصاً آسام، بنگال، بہار، مدھیہ پردیش اور اڑیسہ کے بعض علاقوں میں کول اور منڈا زبانیں بولی جاتی ہیں جن کا ماخذ آسٹرک زبان سے ہی ہے۔یہاں تک کہ دریائے گنگا کا یہ نام بھی آسٹرک زبان کا عطیہ ہے۔

زبانوں کا دراویدی خاندان:

ہندوستانی زبانوں کا تیسرا اہم خاندان دراویدی خاندان کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو آسٹرک نسل کے فوراً بعد بحیرۂ روم سے ہندوستان وارد ہوئے تھے اور وادیٔ سندھ کو اپنا مسکن بنایا تھا لیکن آہستہ آہستہ ملک کے شمالی حصوں میں پھیلتے گئے اور اپنی زبانوں کی ترویج و ارتقاء میں کوشاں رہے۔اس خاندان کی چار بڑی زبانیں کنڑی،تلگو،تامل،ملیالم کے نام سے مشہور ہوئیں۔اس نسل نے سنسکرت زبان اور اس کے وسیلے سے ہند آریائی خاندان کو بہت حد تک متاثر کیا۔

زبانوں کا تبتی برمی خاندان:

وہ زبانیں جو تبت و برما میں بولی جاتی ہیں،تھوڑے بہت فرق کے ساتھ وہی زبانیں ہیں جو ہندوستان میں بولی جاتی ہے اور ہمالیائی کہلاتی ہیں۔یہ زبان سکم اور بھوٹان کے علاوہ مغربی ہندوستان کے لداخ اور مشرقی ہندوستان کے ناگا پہاڑیوں میں بولی جاتی ہے۔زبانوں کا یہ خاندان تبتی برمی خاندان کہلاتا ہے، جو بعض تبتی-چینی اور منگولی قبائل کے ہندوستان آنے کے سبب اپنے بعض اثرات چھوڑ گیا۔ان کے لسانی سرمایے میں

خاطر خواہ کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

زبانوں کا ہند آریائی خاندان:

زبانوں کا مذکورہ بالا خاندان ہندوستانی زبانوں کا سب سے اہم اور قابل ذکر خاندان ہے۔ جس کی ابتدا آریوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو زبان اپنے ساتھ لائے تھے وہ ہند یوروپی کہلاتی ہے اور ہندوستان آنے کے بعد کی بولی ہند ایرانی کہلاتی ہے۔ جس وقت یہ قوم ہندوستان وارد ہوئی اس وقت یہاں دراوڑی خاندان کا اثر و رسوخ تھا اور ان کی بولی رائج تھی لیکن جب آریاؤں کی آمد ہوئی تو انھوں نے دراوڑوں سے مقابلہ کیا۔ دراویدی شاید فنون جنگ سے واقف نہ تھے اس لیے پسپا ہو کر جنوبی ہندوستان میں چلے گئے اور آریہ نسل کے لوگ شمالی ہندوستان میں پھیل گئے اور یہیں ان کی زبان پھلنے پھولنے لگی۔ ماہرین لسانیات نے آریوں کی زبان کے عروج و ارتقا کی درج ذیل طرح سے زمرہ بندی کی ہے:

(1) قدیم ہند آریائی (1500 ق م سے 600 ق م تک)

(2) وسطی ہند آریائی (600 ق م سے 1000ء تک)

(3) جدید ہند آریائی (1000ء سے عصر حاضر تک)

قدیم ہند آریائی زبان کو بھی درج ذیل منزلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(i) ویدک منزل (رگ وید، یجر وید، اتھر وید، سام وید) جس زبان میں وید لکھے جاتے ہیں یعنی سنسکرت، مذہب کی زبان ہوتی ہے۔

(ii) عہد پانی کی منزل (پانی کی اشٹ ادھیائے اور پاتنجلی کی مہابھاشیہ) لکھی جاتی ہیں اس طرح اس دور میں سنسکرت زبان مذہبی علماء کی زبان قرار دی جاتی ہے۔

(iii) رزمیہ منزل: سنسکرت سرکاری زبان بن جاتی ہے، اس کا تعلق مذہب سے ٹوٹ جاتا ہے۔

(iv) ٹکسالی منزل: اس عہد میں سنسکرت قواعد نویسوں کی پابند ہو کر خود کو محصور کر لیتی ہے اور عوام سے دور ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پہلو بہ پہلو عوامی بولیاں پروان چڑھنے لگتی ہیں۔

بہر حال زبان کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک تہذیبی ورثہ ہے۔ کسی بھی زبان کا کوئی عنصر کسی فرد کا کارنامہ نہیں۔

13.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ زبان ایک ایسا نظام ہے جس میں مختلف اصوات اور اشاروں کی مدد سے ایک دوسرے سے رابطہ یا معلومات کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ انسانوں کے علاوہ مختلف جاندار بھی آپس میں ترسیل معلومات کرتے ہیں مگر زبان سے عموماً وہ نظام سے مراد لیا جاتا ہے جس کے ذریعے انسان ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

☆ زبان خود اختیاری اور روایتی صوتی علامات کا وہ نظام ہے جسے انسان معاشرے میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے۔ گویا زبان آوازوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں قواعدی ترتیب ہوتی ہے۔ گویا لفظ جملوں میں قواعدی اصول کے تحت ترتیب دیے جاتے ہیں۔ لسانیات کی ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ لسانیات میں اشاروں اور تحریر کے مقابلے میں زبانی کلمات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

☆ انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقاء میں زبان کا بولنا پہلے اورتحریر کا استعمال بعد میں شروع ہوا۔

☆ بچہ کی پیدائش کے بعد بولنا پہلے شروع ہوتا ہےاور لکھنا بعد میں سیکھتا ہے۔

☆ بہت سی چیزیں زبانی گفتگو میں شامل ہوتی ہیں لیکن تحریر سے ان کا اظہار نہیں ہوسکتا۔

☆ زبان کی ایک خصوصیت اس کا خود اختیاری ہونا ہے۔زبان میں شامل آوازوں کے سلسلے سے جو اشکال بنتے ہیں ان میں اور ان کے معنی میں کوئی فطری تعلق نہیں ہوتا کیونکہ اگر ان میں کوئی ایسا تعلق ہوتا تو دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانیں ایک جیسی ہوتیں۔آوازوں کی ترتیب اور ان کے معنوں میں جو تعلق موجود ہے وہ ہر زبان میں روایت اور رواج پر قایم ہے۔ایک ہی زبان بولنے والے افراد آپس میں ایک غیر تحریری معاہدہ کے پابند ہوتے ہیں جس کے تحت وہ لفظ ومعنی کے آپسی رشتے کے متعلق فیصلہ کرتے ہیں اور یہ طے کرتے ہیں کہ فلاں لفظ سے فلاں معنی سمجھے جائیں گے۔

13.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
اجزائے ترکیبی	کسی مرکب شے کے حصے، وہ اجزا جن سے کوئی چیز بنی ہو
تلخ	کڑوا، مجازاً ناگوار، ناپسند، بےلطف، بے کیف
کرخت	سخت، کڑا، کنایتاً ناگوار، تلخ
لامحدود	جس کی کوئی انتہا نہ ہو، حد بندی سے پرے، بے حد وحساب
تغیرات	تغیر کی جمع بمعنی بدلاؤ، تبدیلی،
سامعین	سامع کی جمع بمعنی سننے والے
مخاطبین	مخاطب کی جمع بمعنی جس سے بات کی جائے، جس سے خطاب کیا جائے
متواتر	مسلسل، تواتر کے ساتھ، لگاتار، بغیر رکے ہوئے
منصب	عہدہ، اعزاز، حیثیت، رتبہ، درجہ، نصب یا قائم ہونے کی جگہ
داعی	بلانے والا، دعوت دینے والا، کارخیر یا مذہب کی تبلیغ کرنے والا
ساختیاتی	متعلق بہ 'ساختیات'، یہ ادبی تخلیق کی پرکھ یا تنقید کی ایک شاخ ہے جس میں الفاظ وتراکیب کی صرفی ونحوی ساخت کو بہت اہم خیال کیا جاتا ہے، اسے انگریزی میں Structuralism کہتے ہیں۔
شغف	کمال رغبت، بہت زیادہ لگاؤ یا دلچسپی، لگن، پسندیدگی
مرورایام	مرور = گزرنا، چلا جانا، بیت جانا، پورا ہونا۔ ایام = یوم کی جمع بمعنی دن یعنی دنوں کا گزر جانا
ماہیت	کسی امر یا شے کی حقیقت، اصلیت، اصل کیفیت
برانگیختگی	غصہ میں بھرا ہوا، غصہ ور، مشتعل

ترسیل/ ابلاغ	روانہ کرنا، بھیجنا، خط بھیجنا، روانگی، ارسال۔ فنِ تجوید میں ترسیل حروف کو ہموار کر کے پڑھنے کو کہتے ہیں
موروثی	باپ، دادا یا اسلاف کے ترکے میں پایا ہوا، میراث یا ورثے میں ملا ہوا، خاندانی/ پشتینی ورثہ میں ملی ہوئی چیز
متنوع	مختلف قسمیں رکھنے والا، قسم قسم کا، طرح طرح کا، عجیب وغریب
عضلات	عضو کی جمع بمعنی گوشت اور پٹھوں سے بنا ہوا
تجریدی	ذہنی وخیالی، اشارت پر مبنی
تلازمہ	لازمی حصہ، کسی چیز کے سارے یا بعض لوازم، مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال جو صنعت شعری میں داخل ہے
متفق علیہ	جس بات پر ایک سے زاید لوگ اتفاق کر لیں، اتفاق کیا ہوا
خلا	خالی جگہ، Space، زمین سے اوپر کا وہ حصہ جہاں زمین کی کشش ثقل کا اثر نہیں ہوتا
بوالعجبی	بازی گری، شعبدہ بازی، انوکھا پن، عجیب شخص، حیران کن، مکاری، چالبازی
افتراق	جدائی، دوری، فاصلہ، انتشار
کثیر اللسانی	کئی زبانوں والا
عبور	راستہ عبور کرنا، پل پار کرنا
ترویج	رواج، شہرت، چلن، اشاعت
مخارج	مخرج کی جمع بمعنی نکلنے یا خارج ہونے کی جگہ، منھ اور حلق وغیرہ کی وہ جگہ جہاں سے کسی حرف کی آواز نکلے
ذو معنی	کئی معنوں والا
بشریات	وہ مسائل جو انسان سے معلق ہوں، بشر سے متعلق مسائل کا علم
عمرانیات	انسانی رہن سہن کا علم، لوگوں کی معاشرت سے متعلق علم اور اس کے اصول
نفسیات	نفس سے متعلق باتوں کا علم، وہ علم جس میں انسانوں کے نفس کی حقیقت سے بحث کی جاتی ہے
صوتی	آواز، لہجہ، صدا، آہنگ، لحن
نطقی	بات کرنے کی طاقت، لفظ بولنے کی قوت، نطق سے منسوب
سمعی	سننے کی طاقت، سماع سے متعلق
منطقی	علم منطق سے منسوب، دلیل یا حجت والا، مدلل
اعضا	عضو کی جمع بمعنی انسانی جسم کے حصے
موقف	نقطۂ نظر، زاویۂ نگاہ، اندازِ فکر
منضبط	باضابطہ، باقاعدہ، طے شدہ
ابتدائے آفرینش	جب سے دنیا کا وجود ہوا تب سے

مادری	ماں کی طرف منسوب، پیدائشی
ثانوی	دوسری، ضمنی، دوسرے درجے کا
نوزائیدہ	نیا جنما ہوا
مستنبط	نکالا ہوا، اخذ کیا گیا، چنا گیا، چھانٹا گیا، بطور نتیجہ نکالا ہوا
طفل	بچہ جمع اطفال
مسکن	ٹھکانہ، گھر، مکان، جائے سکونت، رہنے کی جگہ

13.5 نمونہ امتحانی سوالات

13.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ 'لسان' کے لغوی معنی کیا ہیں؟

2۔ انسان اور جانور میں تمیز کرنے والی کیا چیز ہے؟

3۔ 'زبان' کس زبان کا لفظ ہے؟

4۔ 'لسانیات' کسے کہتے ہیں؟

5۔ کیا زبان کو موروثی کہنا درست ہے؟

6۔ دنیا میں تقریباً کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟

7۔ پیدائش کے بعد بچہ پہلے بولنا سیکھتا ہے یا لکھنا؟

8۔ مصوتہ سے کیا مراد ہے؟

9۔ مادری زبان کے کیا معنی ہیں؟

10۔ مصمتہ کسے کہتے ہیں؟

13.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ زبان اور بولی کے فرق کو واضح کیجیے؟

2۔ مادری زبان اور ثانوی زبان کی تعریف لکھیے؟

3۔ زبانوں کے خاندان سے کیا مراد ہے۔ وضاحت کیجیے؟

4۔ ''زبان ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے'' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

5۔ زبان کس طرح وجود میں آتی ہے؟

13.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ زبان کے سلسلے میں مولانا آزاد کے نظریہ کی وضاحت کیجیے؟

2۔ زبان کی اقسام پر ایک نوٹ قلمبند کیجیے؟

3۔ زبان اور بولی کے درمیان فرق کو واضح کیجیے؟

13.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	جدید اردو لسانیات	ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین
2۔	زبان کا ارتقا	خلیل صدیقی
3۔	لسانی مطالعہ	پروفیسر گیان چند جین
4۔	لسانیات کے بنیادی اصول	اقتدار حسین خاں
5۔	لسانی رشتے	پروفیسر گیان چند جین
6۔	اردو زبان اور لسانیات	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اکائی 14 : ہندآریائی زبانوں کا عہدواری ارتقا

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 ہندآریائی زبانوں کا عہدواری ارتقا
14.2.1 ہندآریائی کا پس منظر
14.2.2 آریاؤں کی ہندوستان آمد
14.2.3 ہندآریائی کے ادوار
14.2.4 قدیم ہندآریائی دور[500 تا1500ق م(1000سال)]
14.2.5 وسطی ہندآریائی دور[500ق م تا1000ء(1500سال)]
14.2.6 جدید ہندآریائی زبانوں کاارتقاء(1000ءتاعہدِحاضر)
14.3 اکتسابی نتائج
14.4 کلیدی الفاظ
14.5 نمونہ امتحانی سوالات
14.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.5.2 مختصرجوابات کے حامل سوالات
14.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.6 مزیدمطالعے کے لیے تجویزکردہ کتابیں

14.0 تمہید

اپنی لسانی خصوصیات کی بنا پر دنیا کی سبھی زبانوں اور بولیوں کومختلف خاندانوں میں منقسم کیا جاتا ہے،جنھیں ہم خاندان السنہ (Language Family) کے نام سے جانتے ہیں، چنانچہ زبانوں کا سب سے بڑا خاندان ہندیوروپی خاندان ہے۔اسی ہندیوروپی خاندان کی ایک مشرقی شاخ ہندآریائی کہلاتی ہے۔ ہندآریائی زبانوں کے عروج وارتقا کی ایک طویل تاریخ ہے۔ہندیوروپی خاندان کی جن زبانوں کاتعلق ہندوستان سے ہے،انھیں ہندآریائی زبانیں کہاجاتا ہے۔اس کا آغاز شمالی ہندوستان میں آریوں کے ورودِ ہندوستان سے ہوتا ہے۔آریوں کی آمد کے سبب سے یہاں جس زبان کی نشوونما ہوئی اسے ویدک سنسکرت کہتے ہیں۔ویدک سنسکرت کے قدیم ترین نمونے ہندوؤں کی مقدس کتاب ''رگ

ویدٗ‘‘میں ملتے ہیں۔ یہی زبان جب ادب اور قواعد کے اصول وضوابط میں مقید ہوئی تو کلاسیکی سنسکرت کہلائی۔قواعدی اصولوں میں یہ زبان اس طرح منضبط ہوئی کہ 400 ق م تک پہنچتے پہنچتے اس نے دم توڑ دیا اور اس کی جگہ عوام نے ایک ایسی فطری زبان اختیار کر لی جو تلفظ اور قواعد دونوں کے اعتبار سے آسان اور سلیس تھی۔ یہ زبان پراکرت کہلائی۔کچھ عرصہ بعد یہ پراکرتیں بھی قواعدی اصولوں کے شکنجے میں کس گئیں تو عوامی زبان کے دھارے کا رخ ایک بار پھر بدل گیا اور ایک مرتبہ پھر سادہ، سہل اور فطری زبان اختیار کرنے پر عوام مجبور ہوئی، جو پراکرت کی بگڑی ہوئی شکل کے طور پر سامنے آئی۔ یہی بگڑی ہوئی شکل اپ بھرنش کہلائی۔اپ بھرنشوں کی نشو ونما500 سے 1000ء تک ہوتی رہی پھر اس کے بعد اس کے ارتقائی عمل میں تیزی آئی اور مختلف اپ بھرنشوں سے مختلف جدید ہند آریائی زبانوں کے سوتے پھوٹے۔ ہند آریائی خاندان کی ایک مشہور اور مقبول زبان اردو کا تعلق بھی جدید ہند آریائی سے ہے۔جس کی داغ بیل ہندوستان کی دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح 1000ء کے بعد پڑی اور مغربی ہندی کی ایک بولی (کھڑی بولی) اس کا ماخذ قرار پائی۔اردو زبان کی ایک مربوط لسانی تاریخ رہی ہے، جس کا ہند آریائی پس منظر ساڑھے تین ہزار سال کے عرصے پر محیط ہے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ مختلف زبانوں، بولیوں اور ان کے خاندانوں کو جان سکیں۔
☆ ہند آریائی زبان کی ابتدا اور عروج وارتقا سے واقف ہو جائیں گے۔
☆ ہند آریائی زبان کے خاندانوں سے متعلق علم میں اضافہ ہوگا۔
☆ ہندوستان کی جدید زبانوں کے آغاز وارتقا کی معلومات حاصل ہوگی۔
☆ ہند آریائی اور اردو کے باہمی رشتے سے واقفیت ہو جائے گی۔
☆ اردو کی لسانی ساخت کے متعلق جان سکیں گے اور اردو کی لسانی خصوصیات سے بہرہ مند ہوں گے۔

14.2 ہند آریائی زبانوں کا عہدواری ارتقا

اس کائنات رنگ وبو میں بولی جانے والی تمام زبانوں کا صحیح تعین اور اس کی تعداد کا اندازہ لگانا قدرے مشکل کام ہے۔تاہم ماہرین لسانیات نے ایک محتاط اندازے کے مطابق زبانوں کی تعداد پانچ ہزار سے سات ہزار بتائی ہے۔ان میں مشہور زبانوں کی تعداد قیاساً دو ہزار سات سو چھیانوے (2796) بتائی جاتی ہے۔ان میں بعض زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف جبکہ بعض زبانیں آپس میں مخلوط اور مماثلت رکھتی ہیں جو زبانیں باہم مماثلت رکھتی ہیں انہیں ’’ہم رشتہ زبانیں‘‘ (Related Languages) کہا جاتا ہے اور انہیں ایک ہی زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہم رشتہ زبانوں کے اسی گروہ یا زمرے کو ’’لسانی خاندان‘‘ (Language Family) بھی کہتے ہیں۔اس حوالے سے سنسکرت، یونانی، لاطینی، کیلٹک اور جرمانک وغیرہ زبانوں میں اپنی بناوٹ ساخت کے اعتبار سے باہم یکسانیت پائی جاتی ہے۔ان کی موجود مماثلتیں اور یکسانیت آپس میں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا ارتقا کسی ایک مشترک ماخذ سے ہوا ہے۔ جب ہم زبانوں کے ان خاندانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ہند یورپی خاندان السنہ دنیا کا سب سے بڑا اور اہم لسانی خاندان ہے۔اس میں شامل زبانیں روس اور یورپ کے تقریباً سبھی ممالک

کے علاوہ ہندوستان، پاکستان، افغانستان، ایران، بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح سے ہند یورپی زبانوں کے خاندان کی حسب آٹھ مشہور شاخیں سامنے آتی ہیں:

آمینین، بالٹک یا سلافی خاندان، البانوی، یونانی، اطالوی، کیلٹک، ٹیوٹائی، ہند ایرانی خاندان۔

جبکہ ہند ایرانی خاندان کو دو مشہور خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(1) ایرانی خاندان اور (2) ہند آریائی خاندان

زبانوں کے مذکورہ خاندانوں میں سے ہند آریائی، ہند یورپی خاندانِ السنہ کی ایک اہم شاخ ہے، جس کا عروج اور ارتقا ہندوستان میں عمل میں آیا۔ ان زبانوں کو ہند آریائی کے نام سے اس لیے موسوم کرتے ہیں کیونکہ ان زبانوں کا ارتقا ایران سے ہندوستان آ کر رہنے بسنے والے آریا قوم کی زبان کے توسط سے ہوا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تاریخ ساڑھے تین ہزار سال قدیم ہے۔ آریاؤں کی زبان کے قدیم ترین نمونے ان کی مقدس کتاب "رگ وید" میں ملتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ "اردو" زبان کا تعلق بھی اسی ہند آریائی خاندان سے ہے۔

ہند آریائی کا ارتقا درج ذیل تین ادوار میں ہوا ہے:

(1) قدیم ہند آریائی

(2) وسطی ہند آریائی

(3) جدید ہند آریائی

14.2.1 ہند آریائی کا پس منظر

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی زرخیزی اور شادابی میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی طرف ہر ملک اور قوم کے لوگوں نے رخ کیا اور اس کی زرخیزی سے مستفید ہوئے۔ اس کی تاریخ گزشتہ پانچ ہزار سال پر محیط ہے۔ یہاں صوفیاء، بزرگان دین، سادھو، سنت سبھی آتے رہے ہیں۔ اسی لیے یہاں کی تہذیب مشترکہ تہذیب ہے۔ یہاں مختلف مذاہب اور اقوام کے لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ یہاں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا حسن پایا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے مختلف ممالک سے لوگ کے یہاں آتے رہے ہیں، ان واردین میں بعض قدیم باشندے درج ذیل ہیں:

(1) نگریٹو (Negretos): یہ لوگ افریقہ سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔

(2) پروٹو آسٹرلوائیڈ (Proto-Australoid) فلسطین سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔

(3) آسٹرک (Austric) براستہ عراق بحیرۂ روم سے آ کر شمال ہندوستان کے حصوں میں بس گئے ہیں۔

(4) دراوڑی (Dravidians) یہ لوگ بحیرۂ روم اور ایشیائے کوچک کے باشندے تھے۔ وہاں سے ہجرت کر کے عراق گئے پھر بلوچستان ہوتے ہوئے تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں ہندوستان وارد ہوئے۔ ان لوگوں نے پنجاب اور سندھ کے علاقے ہڑپا اور موہن جوڑو کو اپنا مسکن بنایا۔ ہڑپا اور موہن جوڑو کے باقیات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں دراوڑی زبانیں بولنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی تہذیب وتمدن کی بنیاد دراوڑیوں نے ہی استوار کی۔ لسانی نقطۂ نظر سے وہ بہت متمدن قوم تھی اور ان کا اپنا رسم الخط، ہندسے اور تقویم تھی۔ آریا جب

ہندوستان آئے تو انھوں نے بھی دراوڑی تہذیب سے اکتساب فیض کیا۔

14.2.2 آریاؤں کی ہندوستان آمد

آریا قوم ۱۵۰۰ق م میں اپنے وطن وسط ایشیا سے عازم سفر ہوئے اور ایران، افغانستان میں کچھ دنوں قیام کر کے ہندوستان کا رخ کیا اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ جب آریا آئے تو اپنے ساتھ ایک زبان بھی لائے اور جس طرح بطور نسل وہ یہاں کی تمام نسلوں پر غالب آ گئے اسی طرح ان کی زبان نے بھی یہاں کی تمام زبانوں کو آہستہ آہستہ اپنے اندر ضم کر لیا سوائے دراوڑی زبانوں کے، جو دریائے سندھ کے کنارے آباد لوگوں کو جنوبی ہند کے نسبتاً بنجر میدانوں کی طرف بھگا دینے سے باقی رہ گئیں۔ تعجب ہے کہ یہ نظریہ اس عہد بعید سے متعلق ہے جس کا تصور آج شاید اتنا آسان نہیں جتنا سمجھ لیا گیا۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کا موضوع بلاشبہ برصغیر کی تاریخ سے منسلک ہے اور معلومہ تاریخ کا پہلا پڑاؤ اس خطے میں آریاؤں کی آمد ہے۔

گذشتہ نصف صدی میں آثار قدیمہ کی نئی دریافتوں، نوآبادیاتی عہد کے مورخین اور ماہرین لسانیات کی غیر لسانی تحریروں کی روشنی میں آریاؤں کے دیسی یا بدیسی ہونے کے بحث ایک دفعہ پھر اہمیت اختیار کر چکی ہے بلکہ یہاں تک بھی کہا جانے لگا ہے کہ آریا کوئی نسل نہیں بلکہ یہ لفظ برہمن لوگوں کی زبان کو ایک نام دینے کے لیے پہلی دفعہ استعمال کیا گیا تھا۔ بہر حال آریاؤں کا اصل وطن وسط ایشیا کا ایک خشک پہاڑی حصہ تھا، مگر انھوں نے اس علاقے کو خیر باد کہہ کر زرخیز زمین کی تلاش میں 1500 قبل مسیح ہندوستان آنا شروع کیا۔ آریا اپنے ساتھ اپنی تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد اور اپنی زبان بھی لائے۔ یہی زبان ہندوستان کو اُن کا عطیہ سمجھا جاتا ہے۔ قدیم آریائی قوم کی ایک بڑی دین رسم الخط بھی ہے، جس کا ارتقا ہندوستان میں ہوا اور جو ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاوٹوں کا منبع بنا، جسے آریا ابتدا ہی سے اپنی زبانوں کے لیے بھی استعمال کر رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھ ہندسے اور تقسیم بھی لائے تھے۔

14.2.3 ہند آریائی کے ادوار

تقابلی لسانیات کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی عیسوی میں ہوا اور اسی کی بدولت دنیا کی تمام زبانوں کو مغربی ماہرینِ لسانیات نے چند خاندانوں میں تقسیم کر دیا۔ برصغیر کی قدیم سنسکرت اور مغربی زبانوں میں اشتراکات کی بنا پر ہند یورپی خاندان کی تشکیل ہوئی اور اس خطے کی بیشتر زبانوں کو آریا قوم کی مناسبت سے مذکورہ خاندان کی ہند آریائی شاخ کا نام دیا گیا۔ ہند آریائی کو ماہرین لسانیات نے مزید تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

قدیم ہند آریائی کے عروج وارتقا کو عام طور پر درج ذیل تین ادور میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

(الف) قدیم ہند آریائی عہد کو 500 ق م سے 1500 ق م تک مانا جاتا ہے جو تقریباً 1000 سال کو محیط ہے۔

ان کے دو ذیلی ادوار بھی ہیں جنھیں درج ذیل طریقے سے تقسیم کیا گیا ہے:

(i) ویدک سنسکرت (1000 ق م تا 1500 ق م یعنی 500 سال)

(ii) کلاسیکل سنسکرت (500 ق م تا 1000 ق م یعنی 500 سال)

(ب) وسطی ہند آریائی کے عروج وارتقا کو درج ذیل تین ذیلی ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

(۱) پالی اور اشوکی کا دور [500 ق م تا مولود مسیح یعنی ایک عیسوی (500 سال)]

(۲) پراکرتوں کا دور [مولود مسیح (ایک عیسوی) تا 500ء (500 سال)]

(۳) اپ بھرنشوں کا دور[500ء تا 1000ء(500 سال)]

(ج) جدید ہند آریائی کے عروج وارتقا کو 1000ء سے عصر حاضر تک مانا جاتا ہے۔

14.2.4 قدیم ہند آریائی دور[500 تا 1500 ق م(1000 سال)]

ہند آریائی کا قدیم دور 1500 ق م تک ہے جو پورے ایک ہزار سال تک قائم رہا۔ یہ دور آریاؤں کی قدیم زبان سنسکرت کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔اس دور میں علاقائی سطح پر سنسکرت کی مختلف شکلیں نمودار ہوتی ہیں چنانچہ زبان کو محفوظ کرنے اور اس کے ارتقا کی غرض سے قواعد لکھے گئے۔ویدک سنسکرت کی قواعد، عظیم قواعد نویس پاننی نے تحریر کیے۔سنسکرت زبان کو دو واضح حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔(1) ویدک سنسکرت یا ویدک زبان (2) کلاسیکل سنسکرت یا عوامی سنسکرت۔کبھی کبھی سنسکرت کا اطلاق دونوں ادوار پر ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ویدک زبان، سنسکرت کی قدیم شکل ہے، علاحدہ زبان نہیں۔سنسکرت اسم مونث ہے جو دو الفاظ 'سنس' اور 'کرت' کا مجموعہ ہے۔سنس کے معنی 'پاک، مقدس اور شستہ جبکہ 'کرت' کے معنی 'کرنے' کے ہیں۔مطلب پاک وصاف کی ہوئی زبان یعنی مقدس، افضل، مکمل، شستہ اور اچھی طرح آراستہ کی ہوئی مزین، عمدہ زبان۔یہ ہند آریائی کا وہ ہزار سالہ دور ہے جس میں پہلے ویدک ادب اور بعد میں کلاسیکی سنسکرت کو عروج حاصل ہوا۔ویدک زبان کے نمونوں کے طور پر چاروں ویدوں [رگ وید، سام وید، یجر وید، اتھر وید] اور اس زبان کی ترقی یافتہ شکل (کلاسیکی) کے نمونوں کے طور پر برہمن گرنتھ، اُپنشدوں اور سوتروں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔سنسکرت زبان کو درج ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(1) ویدک سنسکرت (2) کلاسیکی سنسکرت

(1) ویدک سنسکرت قدیم:

آریائی عہد میں ہندوستان میں شمال مغرب سے مشرق کے علاقوں میں جس زبان کا ارتقا اور عروج عمل میں آیا اسے سنسکرت کہتے ہیں۔اس زبان کے سب سے قدیم نمونے ہمیں ویدوں کی زبان میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس لیے اس زبان کو ویدک سنسکرت کہا جاتا ہے۔اس زبان کی قدیم وید ''رگ وید'' ہے جو ہندوؤں کی مقدس کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔اس کے علاوہ اس عہد میں تین اور وید: سام وید، یجر وید اور اتھر وید تصنیف کیے گئے۔ان ویدوں کی زبانوں میں تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے۔''رگ وید'' کی تصنیف کا زمانہ 1000 ق م سے 1200 ق م تسلیم کیا گیا ہے۔ویدک دور کے قواعد نویس میکڈانل کے مطابق رگ وید ادبی زبان میں تصنیف کی گئی ہے جو بول چال کی زبان سے مختلف ہے۔یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصمتوں کی ہائیت اور معکوسیت جو عصر حاضر کی اردو کی نمایاں صوتی خصوصیات میں سے ہے، ویدک سنسکرت میں ارتقا حاصل کر چکی تھی یعنی اردو کی ہائیہ اور معکوسی آوازیں مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ، اور ٹھ، ڈھ وغیرہ کا وجود قدیم ہند آریائی عہد سے ملتا ہے۔اسی طرح اردو کے سبھی دس مصوتے بھی یعنی اَ، آ، اِ، ای، اُ، اوٗ، اے، او، اَے، اَو بھی ویدک سنسکرت میں پائے جاتے ہیں۔

(2) کلاسیکی سنسکرت

کلاسیکی سنسکرت کا ارتقا ویدک سنسکرت کے بعد عمل میں آیا۔سنسکرت زبان میں جب ادبی تخلیقات کا آغاز ہوا تو یہ کلاسیکی سنسکرت کے نام سے موسوم ہوئی۔دھیریندر ورما کلاسیکی سنسکرت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''یہ مصنوعی یا ادبی زبان تھی'' 'مہابھارت' اور 'رامائن' جیسی مقدس کتابیں کلاسیکی سنسکرت میں ہی لکھی گئیں جو عالمی ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔کلاسیکی سنسکرت کو عام اصطلاح میں صرف 'سنسکرت' کہتے ہیں لیکن کبھی کبھی ویدک

سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت کو ملا کر سنسکرت کہا جاتا ہے۔ ویدک سنسکرت کو کبھی کبھی ویدک زبان بھی کہہ دیا جاتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ صوتی اور قواعدی اعتبار سے ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت میں تضادات بھی پائے جاتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اردو کا لسانیاتی رشتہ سنسکرت سے استوار ہے۔ اردو بالخصوص قدیم اردو میں سنسکرت کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں، جنہیں 'تتسم' کہتے ہیں۔ اردو کے صوتی نظام میں بھی سنسکرت نژاد آوازیں بھی موجود ہیں جو عربی و فارسی اصوات سے بہ لحاظ تعداد زیادہ ہیں کیونکہ بنیادی طور پر اردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ 500 ق م تک پہنچتے پہنچتے 'سنسکرت' زبان دم توڑنے لگی اور اس کی جگہ ایک نئی زبان 'پراکرت' نے لے لی جو سنسکرت کی ہی بدلی ہوئی شکل تھی۔ اس عہد کے ایک عظیم قواعد نویس پانینی نے لسانی تبدیلی کے اس عمل کو محسوس کیا اور اس کے سدباب کے لیے اس نے ''اشتادھیائی''، تخلیق کی اور سنسکرت زبان کو قواعد کے اصولوں میں مقید کر دیا۔ پانینی سنسکرت زبان کا جید عالم اور ماہر صوتیات اور قواعد نویس تھا۔

پراکرتوں کا آغاز و ارتقاء:

ہند آریائی کے ارتقا کے دوسرے دور کو وسطی ہند آریائی کہا جاتا ہے۔ یہ دور 500 ق م سے 1000 سن عیسوی تک مانا جاتا ہے۔ اس دور میں پراکرتیں پھیلتی پھولتی اور پروان چڑھتی رہیں۔ سنسکرت کے زوال کے بعد 500 ق م سے پراکرتوں کا ظہور ہوا۔ ''پراکرت' در حقیقت ایک ایسی زبان تھی جو سنسکرت زبان میں تبدیلی کے نتیجے کے طور پر فطری طور پر ظاہر ہوئی تھی۔ یہ ایک سہل اور سادہ زبان مانی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ یہ عوام میں مقبول ہوگئی۔ اس کے علاوہ سنسکرت زبان کو مذہبی تقدس بھی حاصل ہو گیا تھا اور یہ عام لوگوں سے زیادہ پنڈتوں اور پروہتوں کے تصرف میں آچکی تھی۔ پراکرت سنسکرت کی ہی کوکھ سے پیدا ہوئی۔ لسانیات کا عام اصول ہے کہ جب ایک زبان مٹنے لگتی ہے تو اس کے بطن سے دوسری زبان پیدا ہو جاتی ہے جو پچھلی زبان کی متغیر شکل ہوتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ بھی مردہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی زبان وجود میں آجاتی ہے۔

زبانوں کے ارتقا اور فنا کا یہ سلسلہ مرور ایام کے ساتھ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ چنانچہ پراکرت کا ماخذ و منبع سنسکرت زبان ہی ہے۔ جب سنسکرت زبان کے تلفظ، قواعد اور نحوی وصرفی ہیولی میں کافی حد تک تبدیلیاں ظاہر ہو چکیں تو یہ زبان بالکل تبدیل ہوگئی۔ سنسکرت کی یہی بدلی ہوئی شکل ''پراکرت'' کہلائی۔ سنسکرت زبان میں تبدیلی کا یہ عمل لسانیات کی مختلف سطحوں پر دیکھا جاسکتا ہے مثلاً تلفظ یا صوتیات کی سطح پر اس زبان میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ظاہر ہوئی کہ اس کے مصمتی خوشے ٹوٹ کر مشدد بن گئے۔ اس تبدیلی کو صوتی ادغام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پراکرت میں صوتی ادغام کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، جن میں مصمتی خوشے کا ایک مصمتہ ٹوٹ کر دوسرے مصمتے کے ساتھ مدغم ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

سنسکرت	پراکرت	اردو
پُر	پُت	پوت
ہست	ہتھ	ہاتھ
شُشک	سکھ	سوکھ
دگدھ	دُدّھ	دودھ
مِر	مِت	میت
ادی	اج	آج

اگن	اگیّ	آگ
پتر	پت	پتا

شورسینی پراکرت شورسین کے علاقہ کے زبان تھی، جس کا مرکز متھرا تھا۔ کھڑی بولی ان میں سے ایک ہے جو اردو کی بنیاد اور اصل واساس ہے۔
ماگدھی پراکرت بنیادی طور پر مگدھ کے علاقے میں بولی جاتی تھی جو اب جنوبی بہار کا حصہ ہے۔ اردو ماگدھی پراکرت کا علاقہ شورسینی پراکرت اور ماگدھی پراکرت کے درمیان کا علاقہ تھا۔ اردھ ماگدھی پراکرت نے جین مذہب کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ جین مذہب کے متبعین کی ابتدائی مذہبی اور ادبی تصانیف اسی پراکرت زبان میں لکھی گئیں۔ مہاویر جین نے جس زبان میں جین مذہب کی تعلیمات دیں وہ اردو ماگدھی کی قدیم شکل تھی۔ یہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب زبان تھی۔ اردو ماگدھی میں 'ر' اور 'ل' دونوں آوازیں پائی جاتی ہیں لیکن سنسکرت کا 'ش'، 'س' کی آواز میں بدل جاتا ہے۔

مہاراشٹری پراکرت مہاراشٹر کی زبان تھی اور تمام ادبی پراکرتوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ادبی پراکرت تسلیم کی جاتی تھی۔ قواعد نویسوں نے اسے 'مثالی پراکرت' کا نام دیا ہے، جو پنجاب اور کشمیر میں بولی جاتی تھی لیکن اس میں ادبی تصانیف کا فقدان ہے۔ یہ خالص ہند آریائی زبان نہیں ہے۔

14.2.5 وسطی ہند آریائی دور [500 ق م تا 1000ء (1500 سال)]

ہند آریائی کے اس پندرہ سو سالہ دور کو آسانی کے لیے مزید تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(الف) پالی اور اشوکی کا دور (500 ق م، پیدائشِ مسیح):

'پالی' مہاویر سوامی اور مہاتما بدھ کے عہد یعنی پانچویں صدی مسیح قبل کی یادگار ہے حالانکہ اسے پالی کا نام مستشرقین نے دیا ہے۔ بدھ مذہب سے متعلق تمام اُپ دیش پالی میں موجود ہیں۔ اس زبان کو ماگدھی بھی کہا گیا لیکن ماگدھی نام چونکہ ایک پراکرت کا بھی ہے اس لیے 'پالی' نام پر اتفاق رائے ہوا۔

'اشوکی' موریا سلطنت کے حکمران اشوک موریا کے عہد یعنی تیسری صدی مسیح قبل کی یادگار ہے جو مختلف پتھروں اور لوٹوں پر کندہ اشوک کے فرامین وغیرہ کی صورت میں ملتی ہے۔ اس زبان کو شِلا لیکھ بھی کہا جاتا ہے اور اس میں بعض اوقات ایک سے زیادہ بولیوں کی موجودگی کا ذکر بھی ملتا ہے۔

(ب) پراکرتوں کا دور (پیدائشِ مسیح-500):

اس عہد میں سنسکرت کا ارتقا قواعد کی جکڑ بندیوں کی وجہ سے مجروح ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن سنسکرت ابھی مردہ نہیں ہوئی تھی بلکہ سنجیدہ ادب کی تخلیق میں وسیلۂ اظہار کا کام کر رہی تھی حالانکہ عام بول چال کی زبانوں سے اس کا اختلاف بڑھنا شروع ہو چکا تھا۔ پراکرت کا لفظ لسانیات کی اصطلاح میں عام بول چال اور فطری زبان کے لیے مخصوص ہو چکا ہے گویا ایک ادبی زبان کے ساتھ بہت سی پراکرتیں موجود ہو سکتی ہیں۔ پراکرتوں کے دور کا آغاز عموماً 'پالی' سے ہی تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ مہاتما بدھ نے اسے عام بول چال کی زبان کے طور پر تبلیغ کے لیے اپنایا تھا لیکن جب یہ انتخاب ہوا اس وقت یہ اکیلی عام بول چال کی زبان تو نہیں ہوگی بلکہ اس کے علاوہ بھی مختلف زبانیں رائج ہوں گی۔ ان تمام زبانوں کو بھی پراکرتیں قرار دیا جاتا ہے لیکن وہ پہلی صدی عیسوی کے بعد زیادہ نکھر کر سامنے آئیں نیز ادبی صورت اختیار کرنے لگیں۔ ان پراکرتوں میں مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، اردھ ماگدھی اور پشاچی شامل ہیں۔ بعض ماہرین لسانیات نے اپ بھرنشوں میں سے بھی کچھ کو پراکرتیں تسلیم کیا ہے لیکن زیادہ اہمیت مذکورہ

پانچ کو ہی حاصل ہے۔

(ج) اپ بھرنشوں کا دور(500-1000ء):

جس طرح مذکورہ پراکرتوں کا عروج پہلی صدی عیسوی میں ہوا لیکن اس کو وجود اس سے پہلے بھی تھا۔اسی طرح اپ بھرنشوں کا وجود اسی وقت یعنی تیسری صدی عیسوی سے مانا جاتا ہے جب سے اس کی جھلکیاں پراکرتی ادب میں ملتی ہیں،لیکن ان کے ارتقا کا عہد پانچ سو عیسوی کے بعد کا ہے۔ ابتدا میں 'اپ بھرنش' کا لفظ کسی خاص زبان کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ پڑھے لکھے اور مہذب لوگ 'اَن پڑھ اور گنوار لوگوں کی زبان کو اپ بھرنش کہتے تھے۔دراصل زبان دو سطحوں پر سفر کرتی ہے ایک ادبی سطح اور دوسری عوامی سطح۔جب تک ادبی زبان عام بول چال کی زبان سے الفاظ اخذ کرتی رہتی ہے اور ارتقا کے منازل طے کرتی رہتی ہے اور جب یہ عام بول چال کی زبان کو گنوار اور غیر مہذب سمجھ کر اپنے سے اسے دور ہٹانے لگتی ہے تو اس کا ارتقا رک جاتا ہے اور آہستہ آہستہ لوگوں سے رشتہ ٹوٹنے لگتا ہے پھر وہ زبان مردہ ہو جاتی ہے۔اس قاعدے کا اطلاق دنیا کی تمام زبانوں پر ہوتا ہے۔ مذکورہ پراکرتیں جو کبھی خود عام بول چال کی زبانیں تھیں،ادبی مرتبہ حاصل ہونے کے بعد عام بول چول سے دور ہٹنے لگیں تو اب پھرنشیں نسبتاً عوام سے زیادہ قریب ہونے کی بنا پر اہمیت کی حامل ہو گئیں۔ایہ ہمیت بڑھتے ہوئے اپ بھرنشوں کو عروج کی طرف لے گئیں اور پھر 500ء سے 1000ء تک یہ عروج اپ بھرنشوں کے حصے میں رہا۔بعض ماہرین لسانیات اس دور کو چودھویں صدی عیسوی تک بھی کھینچ کر لے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں 1000ء کے بعد کے زیادہ سے زیادہ ایک سو سال تک اپ بھرنش کے عروج کا دور سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اسی عہد میں ہندوستان کی جدید زبانوں کا ظہور شروع ہو چکا تھا۔اپ بھرنشوں کی تعداد کے حوالے سے بھی ماہرین لسانیات میں اختلاف موجود ہے لیکن ان کی معروف صورتوں میں ناگر، وراچڈ (براچڈ)،کیکئی،ٹکی،اپ ناگر،شورسینی،ماگدھی،اردھ ماگدھی اور مہاراشٹری شامل ہیں۔پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کا باہمی رشتہ جوڑنا ماہرین لسانیات کے لیے مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے جدید ہند آریائی زبانوں کا ماخذ اپ بھرنشوں میں تلاش کیا ہے اور بعض براہ راست پراکرتوں کو ہندوستان کی جدید زبانوں کا منبع سمجھنے لگے۔بہرکیف ان تمام اپ بھرنشوں نے بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بول چال کی زبان سے نکل کر اور قواعد کی جکڑ بندیاں قبول کر کے ادبی صورت اختیار کرنا شروع کر دیں۔ان اپ بھرنشوں میں سے مرکزی ہندوستان کی شورسینی اپ بھرنش کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی،جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ادبی زبان بننے کے ساتھ ہی پورے ہندوستان میں رابطے کی زبان بن گئی۔

پراکرت کی بگڑی ہوئی شکل اپ بھرنش کہلاتی ہے۔بعض ماہرین لسانیات اپ بھرنش کو پراکرت کی ہی ایک شکل تسلیم کرتے ہیں اور اسے ''تیسری پراکرت'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔بہر حال اپ بھرنش کے لغوی معنی ہیں بگڑی ہوئی یا بھرشٹ زبان۔چونکہ اپ بھرنش پراکرت سے پیدا ہوئی ہے اس لیے جہاں جہاں پراکرتیں بولی جاتی تھیں انھیں علاقوں میں اپ بھرنش کا ارتقائی عمل شروع ہوا۔اپ بھرنش کی اصطلاح دوسری صدی قبل مسیح کے عظیم قواعد داں اور 'مہابھاشیہ' کے مصنف پاتنجلی کے دور سے ملتی ہے لیکن اس نے یہ اصطلاح زبان کے معنی میں استعمال کی تھی۔اب بھرنش کے باقاعدہ قواعد گیارہویں صدی عیسوی کے قواعد نویس ہیم چندر نے لکھے۔ماگدھی اپ بھرنش کا ارتقا ماگدھی پراکرت سے ہوا۔اس کا اثر ورسوخ مشرق کے ایک وسیع خطے پر تھا،جس میں بنگال،آسام،اڑیسہ اور بہار کے علاقے شامل ہیں۔ان علاقوں کی جدید زبانیں یعنی بنگالی،آسامی، اڑیا اور بہار کی تقریباً تمام بولیاں ماگدھی اپ بھرنش سے ہی نکلی ہیں۔مغربی ماگدھی اپ بھرنش کی بولیوں کو 'بہار' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس میں تین بولیاں میتھلی،مگہی اور بھوجپوری شامل ہیں۔اردھ ماگدھی اپ بھرنش' شورسینی اپ بھرنش اور ماگدھی اپ بھرنش کے درمیان کے علاقے کی زبان

تھی۔اس سے مشرقی ہندی کی بولیاں وجود میں آئیں۔مہاراشٹری اپ بھرنش کا ارتقاء مہاراشٹری پراکرت سے ہوا جو مہاراشٹر کے علاقے کی زبان تھی،اسی زبان کے بطن سے موجودہ مراٹھی زبان معرض وجود میں آئی۔

14.2.6 جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقاء (1000ء تا عہدِ حاضر)

1000 عیسوی تک آتے آتے تمام اپ بھرنش زبانوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اوران کے مقام پر پورے شمالی ہندوستان میں بہت سی دیگر بولیاں سر اٹھانے لگتی ہیں۔جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء کی تاریخ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور 1193ء میں دہلی کو فتح کرنے کے بعد وہاں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرلی۔سنیتی کمار چٹرجی کے مطابق اگر مسلمان ہندوستان میں وارد نہ ہوئے ہوتے تو جدید ہند آریائی زبانوں کے ادبی آغاز وارتقا میں ایک دوصدی کی تاخیر ہوجاتی۔

یہ قابل ذکر ہے کہ تمام جدید ہند آریائی زبانیں اور بولیاں اپ بھرنش کی کسی نہ کسی ذیلی بولیوں سے پیدا ہوئی ہیں۔اسی لیے ان کے بولے جانے کے علاقے کا تعین نہیں ہوسکا ہے کیونکہ بعض علاقائی لسانی خصوصیات بھی ان میں پائی جاتی ہیں۔اردو کا کھڑی بولی سے پیدا ہونا ایک ایسی لسانی حقیقت ہے جسے کسی بھی طرح جھٹلانا ناممکن ہے۔اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قدیم اردو (قدیم دکنی اردو) پر ہریانوی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔کھڑی بولی کی طرح ہریانوی نواحِ دہلی کی ایک بولی ہے۔دکنی اردو کے تحریری نمونوں کی تاریخی،تہذیبی اور ادبی اعتبار سے اہمیت مسلم ہے لیکن ان کی لسانی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔دکنی اردو کا ادبی سرمایہ ہمارے لیے ایک ایسا منضبط لسانی مواد فراہم کرتا ہے،جس سے زبان اردو کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس میں ظہور پذیر ہونے والی بعض لسانی خصوصیات شمالی ہندوستان کی بولیوں کی مرہون منت ہیں،جن کے خمیر سے یہ زبان تیار ہوئی ہے جبکہ بعض مقامی لسانی اثرات کا نتیجہ ہیں۔

1000ء تک ہند آریائی زبان اپنی تاریخ کے نئے دور'جدید ہند آریائی دور' میں داخل ہوچکی تھی۔ ہندوستانی تاریخ میں عظیم واقعات رونما ہوچکے تھے اور بیرونی عہد آفریں اثرات کے باوجود ہندوستانی تہذیب کا امتزاجی عمل بلا روک ٹوک جاری تھا۔ ہندوستانی طرز معاشرت اور ہندوستانی فکر کا دائرہ برابر وسیع ہوتا رہا۔ ہندوستان کے دل ودماغ اور ہاتھوں کو محسوس کرنے،غوروفکر کرنے اور تخلیق کرنے کی جو آزادی حاصل تھی،اس کے نتیجہ میں انسانیت کے مستقل اقدار کی حامل چیزیں وجود میں آرہی تھیں۔1000ء تک ہندوستانی تہذیب میں علمی اور سائنسی تصورات اور ایسی متعدد فنی تخلیقات شامل ہوچکی تھیں،جنھیں بالآخر آج انسان کی عظیم حصولیابیوں میں شامل کیا جارہا ہے۔آریائی زبان اور کسی حد تک دراویدی نے بھی ہندوستان کی اس تمدنی پیش رفت کا ساتھ دیا۔اول الذکر نے ویدی 'سنسکرت' پالی اور پراکرت کی شکل میں جبکہ موخرالذکر نے تامل،کنڑ اور تلگو کی شکل میں خالص ادب،فلسفہ اور اس دور کے مطابق سائنس کی عظیم المرتبت تخلیقات کی ہیں۔1000ء کے بعد ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی،مذہب اسلام کے مقلد ترکوں اور دیگر غیر ملکیوں کی شمالی ہند اور وہاں کے مسلمانوں کی دکن پر فتح اس کا سبب بنی۔اس کے ساتھ ہی ہندوستانی زبانوں کو ہندوستانی ذہن اور ہندوستانی تہذیب کی نئی شکل کے اظہار کا کام انجام دینا پڑا۔پراکرتوں کا عہد روبہ زوال ہوچکا تھا۔علاقائی اپ بھرنشوں سے گزر کر پراکرتیں جدید ہند آریائی زبانوں میں تبدیل ہوچکی تھیں۔

اصولی طور پر جدید ہند آریائی کے آغاز وارتقا کو'اپ بھرنشوں' کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھا جانا چاہیے لیکن چونکہ آریاؤں کی غیر ممالک سے ہندوستان آمد،آبادی اور پورے ملک پر قابض ہونے کے نظریے کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے،اس لیے مستشرقین نے جدید زبانوں

کی گروہ بندی کبھی افقی خط کے نقشے پر کی اور کبھی دائرے کی شکل پر۔ ہرنلے کے مطابق آریا دو گروہوں میں ہندوستان آئے جبکہ جارج گریرسن نے ان گروہوں کی زبانوں کو ذخیرۂ الفاظ اور صوتیات کی روشنی میں اندرونی اور بیرونی زبانوں میں منقسم کرکے دیکھا ہے۔ ان کی لسانی تقسیم کے نقشے میں موجود اسقام کو سنیتی کمار چٹرجی نے واضح کرتے ہوئے لسانی تقسیم کا ایک نیا نقشہ پیش کیا جس کو جدید زبانوں کی صرفی ونحی بنیاد پر ترتیب دیا گیا تھا۔ جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی کرتے ہوئے لسانی اشتراکات اور اختلافات کو سختی سے ملحوظ خاطر رکھا جائے تو بعض زبانیں اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر ماہرین لسانیات کے بنائے ہوئے کسی بھی گروہ میں شامل نہیں ہوسکیں گی۔ حالانکہ ان میں لسانی خصوصیات موجود ہیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں کو ان کی خصوصیات کی بنیاد پر جارج گریرسن نے کئی گروہوں میں منقسم کیا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

(1) بیرونی زبانیں:

لہندا (مغربی پنجابی)، سندھی، مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، بہاری بولیاں (میتھلی، مگہی، بھوجپوری)

(2) وسطی زبانیں:

مشرقی ہندی (اودھی، بگھیلی، چھتیس گڑھی)

(3) اندرونی زبانیں:

مغربی ہندی (کھڑی بولی، ہریانوی، برج باشا، بندیلی قنوجی) مشرقی)، گجراتی، راجستھانی (مارواڑی/میواڑی، مولوی، جے پوری، میواتی) بھیلی، خاندیشی)

(4) پہاڑی بولیاں:

نیپالی/گورکھار، کمایونی/گڑھوالی، شملہ اور اس کے گردونواح کی پہاڑی بولیاں

پروفیسر مسعود حسن خاں مقدمہ تاریخ زبان اردو میں لکھتے ہیں کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی پرورش و پرداخت پراکرتوں کے بجائے اپ بھرنشوں سے ہوئی ہے۔ ان کا سلسلہ حسب ذیل اپ بھرنشوں سے جا کر ملتا ہے۔

(1) شورسینی اپ بھرنش (کھڑی بولی، راجستھانی، پنجابی (مشرقی) گجراتی۔

(2) ماگدھی اپ بھرنش (بنگالی، آسامی، اڑیا)

(3) اردو ماگدھی اپ بھرنش (پوربی زبانیں، جیسے اودھی، بھوج پوری وغیرہ)

(4) مہاراشٹری اپ بھرنش (مراٹھی)

(5) کیکٹی اور براچراپ بھرنش (پنجابی اور (مغربی) سندھی)

جدید ہند آریائی زبانوں میں سے ماہرین لسانیات نے مغربی ہندی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کے خیال میں یہ وہ زبان ہے جس سے مدھیہ پردیش کی بولیوں: ہریانی، برج، کھڑی، قنوجی، بندیلی نے جنم لیا اور یہ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین بنی۔ گیارہویں صدی عیسوی کے بعد مدھیہ پردیش کی جغرافیائی حدود میں ہریانی، برج، کھڑی، قنوجی، بندیلی، گجراتی، راجستھانی اور پنجابی بول چال کی زبانوں کے طور پر رائج نظر آتی ہیں۔ حتمی طور پر یہ رائے قائم کرنا دشوار ہے کہ ان میں سے نکھر کر پہلے کون سی زبان سامنے آئی۔

جدید ہند آریائی اور اردو کا رشتہ:

اپ بھرنشوں کے خاتمہ کے بعد جدید ہند آریائی کا آغاز 1000ء سے ہوتا ہے۔ دراصل یہ زمانہ محض لسانی تغیر وتبدل کا ہی زمانہ نہیں تھا بلکہ ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر بھی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ ان تبدیلیوں کا یہاں کی بولیوں پر بھی اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ تقریباً1000ء کے آس پاس کا ایک اہم واقعہ مسلمانوں کا شمالی ہندوستان میں ورود ہے، جن میں ترک، افغان اور ایرانی نژاد شامل تھے۔ ان لوگوں نے نہ صرف یہاں سکونت اختیار کی بلکہ ان میں بعض لوگوں نے یہاں کے اقتدار پر بھی قبضہ جمایا۔ یہ قبضہ پہلے پنجاب پر قائم ہوا اور آہستہ آہستہ ان کا اثر ورسوخ دہلی پر ہو گیا نتیجتاً 1193ء میں دہلی کو فتح کر کے وہاں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کر لی۔ دہلی کے پایۂ تخت بننے کے بعد آہستہ آہستہ اس شہر کو اہمیت اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی گئی اور دہلی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا تہذیبی، تمدنی اور سیاسی مرکز بن گیا۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں قربت بڑھی، جس کے سبب یہاں ایک نئی تہذیب کا وجود ہوا اور ساتھ ہی ایک نئی زبان کا خمیر تیار ہونے لگا۔ چونکہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی، اس کے علاوہ ترکی اور فارسی بھی ان کی زبانیں تھیں۔ لہٰذا ان تمام زبانوں کے شمالی ہند کی بولیوں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور بہت تیزی کے ساتھ یہاں کی مقامی بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ داخل ہونے لگے۔ دوسری طرف 1000ء کے آس پاس اپ بھرنشوں میں بھی فطری طور پر تبدیلیاں رونما ہونے لگیں، اور یہی تبدیلیاں اردو کی خشت اول کے طور پر سامنے آئیں۔

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کا خمیر ہندوستان کی دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح 1000ء کے بعد تیار ہوا اور مغربی ہندی کی ایک بولی یعنی کھڑی بولی اس کا منبع قرار پایا۔ مغربی ہندی شورسینی اپ بھرنش کا ماخذ تھی اور شورسینی اپ بھرنش' شورسینی پراکرت سے وجود میں آئی تھی نیز دیگر پراکرتوں کی طرح شورسینی پراکرت کا وجود بھی سنسکرت سے ہوا تھا۔ اس طرح یہ خیال درست ہوگا کہ اردو کا لسانی خاندانی سلسلہ سنسکرت میں جا کر مدغم ہوتا ہے کیونکہ جدید ہند آریائی جس میں اردو بھی شامل ہے، قدیم ہندوستان کی اس زبان کا مولد ہے جسے سنسکرت کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کی ایک منظّم ومربوط لسانی تاریخ رہی ہے جس کا ہند آریائی پس منظر ساڑھے تین ہزار سال کے دورانیہ کو محیط ہے۔

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں کئی نظریات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً محمد حسین آزاد، سلیمان ندوی، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری اور محمود شیرانی وغیرہ لیکن ان کے نظریات کو مسترد کرتے ہوئے گیان چند جین نے کہا ہے کہ اردو کے آغاز کے سلسلہ میں جن لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا انہیں ہم دو حصوں میں منقسم کر کے اس طرح دیکھتے ہیں کہ ایک تو وہ بزرگ ہیں جو لسانیات کا درک نہیں رکھتے مثلاً میر امن، محمد حسین آزاد، نصیر الدین ہاشمی، سلیمان ندوی اور محمود شیرانی۔ یہ حضرات ہند آریائی زبانوں کے آغاز وارتقا سے اس قدر نابلند ہیں کہ کھڑی بولی، اردو اور ہندی کے اشتراک واختلاف کا احساس وعرفان نہیں رکھتے۔ بس صرف اردو سے واقف ہیں اور کچھ نہیں۔ دوسرے زمرے میں وہ اہل نظر ہیں جو تاریخی لسانیات پر نظر رکھتے ہیں مثلاً ڈاکٹر زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری۔ یعنی گیان چند کے نزدیک موخر الذکر زمرے کے دانشوروں کے نظریات قابل قبول ہیں۔

گیان چند جین کے نزدیک بعض ماہرین لسانیات زبان کی پیدائش پر ٹھیک وہی اصول نافذ کرتے ہیں جو انسان کی پیدائش پر نافذ ہوتا ہے

گویا دو زبانوں کے اختلاط سے نئی زبان وجود میں آئی۔ ان ماہرین کا لسانی نظریہ عموماً ذخیرۂ الفاظ پر اساس ہوتا ہے، جبکہ دوسرے زمرے میں وہ ماہرین لسانیات شامل ہیں جو زبان کی پیدائش اور ارتقا پر لسانیاتی انداز ے میں غور کرتے ہیں اور ان کے نظریات صرفی ونحوی اصولوں پر قائم ہوتے ہیں۔ لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ دو یا دو سے زائد زبانوں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان پیدا ہوسکتی ہے۔ دوسرا یہ کہ غیر بنیادی الفاظ کے اشتراک کی بنا پر بھی ایک زبان کا دوسری زبان سے رشتہ قائم نہیں ہوسکتا ہے۔

سنیتی کمار چٹر جی اردو زبان سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ستر ہویں یا اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستانی زبان کی مسلم شکل میں اردو وجود میں آئی۔ مشرقی پنجاب اور گنگا جمنا کے دوآبے پر واقع مدھیہ پردیش کا علاقہ اردو کے اہل زبان کا علاقہ ہے۔ ان کے خیال میں پنجاب اور وسطی علاقے کو اردو کا ماخذ اور منبع قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی یا کھڑی بولی کی نشوونما گیارہ سو سے اٹھارہ سو تک کی سات صدیوں پر محیط ہے۔ ہندوستانی کا ارتقا شمالی ہندوستان اور دکنی ہند کے سیاسی تاریخی، تہذیبی، معاشرتی اور لسانی تحریک و تاریخ کے گرد بکھرا ہوا ہے۔

الغرض ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اردو اس ارتقائی عمل کے تیسرے دور (1000ء تا عہد حاضر) کی زبان ہے۔ گو کہ اس میں ایک سے زیادہ لسانی خاندانوں سے تعلق رکھنے والی زبانوں کے الفاظ اور اصوات موجود ہیں لیکن اپنے صرفی ونحوی ہیولی کے اعتبار سے یہ زبان جدید ہند آریائی ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں کے دستیاب شدہ نمونوں کی روشنی میں اس زبان کے اولین نقوش 1000ء کے بعد دہلی اور اطراف دہلی کی بولیوں میں نظر آنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اس طرح اردو نے ادبی زبان کی صورت پندرہویں صدی عیسوی میں اختیار کی لیکن عام بول چال میں اس کے نقوش تیرہویں صدی اور چودھویں صدی سے ہی ملنا شروع ہوگئے تھے۔ اس کا ماخذ ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی بول چال کی زبان رہی ہوگی۔ جب ہم اردو کی لسانی ساخت پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی لسانی ساخت پر ہند آریائی عناصر کے نقوش واضح انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عناصر ہمیں اس ہند آریائی تہذیب کی یاد دلاتے ہیں جس کا سلسلہ آریوں کے آنے کے بعد سے وابستہ ہے۔ یہ اسی تہذیب کا ثمرہ ہے کہ اردو کی بیشتر لسانیاتی خصوصیات کا سلسلہ اپ بھرنش اور پراکرت سے ہوتا ہوا سنسکرت سے جا کر مل جاتا ہے۔

اردو میں مصمتوں Consonants کی ایک کثیر تعداد سنسکرت اور پراکرت سے اردو میں آئی۔ اردو کی 15 ہائیہ آوازیں (بھ، پھ، تھ، ڈھ، جھ، چھ، کھ، گھ، ڈھ، ڑھ، مھ، لھ، نھ، کھ، رھ) ہند آریائی ماخذ یعنی سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش سے اردو میں در آئیں۔ اسی طرح مصوتے Vowels بھی پراکرت اور اس کے توسط سے سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ اردو کی معکوسی آوازیں اور معکوسی صوتیے بھی ہند آریائی کے توسط سے اردو میں در آئے۔ ان کے بغیر زبان توتلی ہوکر رہ جاتی۔ اس کے سوا اردو میں 14 آوازیں (ب، ت، و، ج، ک، م، ن، ل، ر، س، ش، ہ، و، ی) ایسی ہیں جو ہند آریائی، عربی اور فارسی میں مشترک ہیں یعنی اردو میں ان کا ارتقا ہند آریائی کے توسط سے بھی ہوا ہے اور عربی فارسی سے بھی لیکن اردو میں ان آوازوں پر مشتمل عربی وفارسی الفاظ کی تعداد ان آوازوں سے تشکیل شدہ ہند آریائی الفاظ کے مقابلے بہت کم ہے۔

اصوات کے علاوہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا ایک کثیر حصہ بھی ہند آریائی زبان پر مشتمل ہے، جن میں سب سے زیادہ تعداد 'تد بھو' الفاظ کی ہے۔ سنسکرت کے الفاظ جب اپنی تبدیل شدہ حالت میں مستعمل ہوتے ہیں تو 'تد بھو' کہلاتے ہیں۔ تد بھو الفاظ کی اساس اگر چہ سنسکرت یا قدیم ہند آریائی پر قائم ہے لیکن وسطی ہند آریائی یعنی پراکرت میں شامل ہوکر ان کی شکل وصورت اور ہیئت بدل جاتی ہے۔ سنسکرت کے یہی تبدیل شدہ الفاظ تد بھو کہلاتے ہیں۔ سنسکرت کے الفاظ جب بغیر کسی تبدیلی کے اپنی اصلی حالت میں مستعمل ہوتے ہیں تو ''تتسم'' کہلاتے ہیں مثلاً لفظ دگدھ

خالص سنسکرت کا لفظ ہے جو تتسم کہلاتا ہے۔لیکن پراکرت کے لفظ دڈھ کو جو دگدھ سے مستنبط ہے اور اسی کی تبدیل شدہ شکل ہے، تد بھو کہلاتی ہے۔ جدید ہند آریائی اردو میں یہی دڈھ بن گیا جو تد بھو کی ایک دوسری شکل ہے۔اردو میں تتسم بہت ہی کم تعداد میں ہیں۔اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا بیشتر حصہ تد بھو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی یا ہند آریائی الفاظ اردو کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔اردو کا کوئی بھی جملہ ہند آریائی الفاظ کے بغیر وجود نہیں رکھتا۔

اصوات کے علاوہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا ایک بڑا حصہ بھی ہند آریائی سے ماخوذ ہے۔جن میں سب سے زیادہ تعداد تد بھو الفاظ کی ہے۔ سنسکرت کے الفاظ جب اپنی تبدیل شدہ حالات میں استعمال میں لائے جاتے ہیں تو 'تد بھو' کہے جاتے ہیں۔تد بھو الفاظ کی بنیاد اگرچہ سنسکرت یا قدیم ہند آریائی پر قائم ہے لیکن وسطی ہند آریائی یعنی پراکرت میں ضم ہونے کے بعد اس کی شکل وصورت میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔سنسکرت کے یہی تبدیل شدہ الفاظ تد بھو کہلاتے ہیں۔سنسکرت کے الفاظ جب بغیر کسی رد و بدل کے اپنی اصل حالت میں استعمال کیے جاتے ہیں تو 'تتسم' کہے جاتے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا بیشتر حصہ تد بھو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی یا ہند آریائی الفاظ اردو زبان کے لیے لازمی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اردو کا کوئی بھی جملہ ہند آریائی الفاظ کے بغیر تشکیل نہیں پاسکتا جبکہ ایسے بے شمار اردو جملے ترتیب دیے جاسکتے ہیں جن میں کوئی بھی عربی یا فارسی کا لفظ استعمال میں نہ لایا جائے، جیسے درج ذیل جملوں پر نظر ڈالیے جو خالص ہند آریائی الفاظ پر مشتمل ہے:

تم ایک اچھے لڑکے ہو۔وہ اسکول جائے گا۔تم کہاں گئے تھے؟ وغیرہ۔

اس ضمن میں اردو میں انشاء اللہ خاں انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' اور آرزو لکھنوی کی ''سریلی بانسری'' دو ایسی کتابیں ہیں جن میں ایک بھی عربی یا فارسی کا لفظ استعمال میں نہیں لایا گیا ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو الفاظ کا بنیادی ماخذ ہند آریائی ہی ہے۔اس کے علاوہ اردو کے ضمائر (Pronoun) اور حروف جار (Prepositions) بھی ہند آریائی ماخذ سے ہی اردو میں آئے، جن کی حیثیت بھی بنیادی ذخیرۂ الفاظ کی ہے۔

14.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ آریاؤں کا اصل وطن وسط ایشیا کا ایک خشک پہاڑی علاقہ تھا، جس سے تنگ آکر اور زرخیز زمین کی تلاش میں انہیں اپنا وطن ترک کرنا پڑا۔یہ لوگ 1500ء ق م میں ہندوستان آئے۔ پہلے پہل یہ سندھ میں داخل ہوئے اور وہاں سے پنجاب اور پھر مشرقی ہندوستان آکر آباد ہونا شروع ہوئے۔

☆ آریا جو زبان اپنے ساتھ لائے تھے وہ ہندوستان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔یہ اپنے ساتھ ایک رسم الخط بھی لائے تھے جو براہمی رسم الخط کہلاتا تھا۔اس کا ارتقا ہندوستان میں ہی ہوا۔

☆ ہند آریائی کے تین ادوار ہیں:

(1) قدیم آریائی دور (500 ق م 1500 ق م)

(2) وسطی ہند آریائی دور (500 ق م تا 1000ء)

(3) جدید ہند آریائی دور (1000ء تا حال)

☆ اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے، جس کی داغ بیل ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبانوں اور مغربی ہندی کی کھڑی بولی کے اختلاط سے پڑی۔

14.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
ادوار	دَور کی جمع، عہد
شستہ	صاف، معیاری
متبعین	متبع کی جمع، پیروی کرنے والے، پیروکار
صوتی نظام	آوازوں کا نظام
پراکرت	وہ زبانیں جو سنسکرت سے نکلی ہیں
اپ بھرنش	پراکرتوں کی بدلی ہوئی غیر معیاری شکلیں
قبل مسیح	حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل
نعمت غیر مترقبہ	وہ نعمت جس کے ملنے کا گمان نہ ہو، جو بغیر محنت کے مل جائے
ورود	کہیں سے آنا
اپدیش	تعلیمات
کلاسیکی	قدیم
منبع	سوتا یا چشمہ، نکلنے کی جگہ، زمین کے اندر سے پانی نکلنے کی جگہ
ماخذ	وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز لی جائے، حوالہ
مخلوط	ملی جلی
اختلاط	میل جول
خاندان السنہ	زبانوں کا خاندان
مسکن	گھر ٹھکانہ
ہندسے	گنتی کا عدد یا اس کی قسم
تقویم	وہ نظام جس میں ماہ و سال کا حساب ہو، کیلنڈر (Calendar)

خیر باد	رخصت ہونا، وہ کلمہ جو وقت رخصت بولا جاتا ہے
مولود	پیدا شدہ، جو پیدا ہوا ہو
قواعد نویس	گرامر (قواعد) لکھنے والا
مصمتہ	ہم آہنگ، صوتی مناسبت رکھنے والے الفاظ
مصوتہ	جن آوازوں کے لیے منہ کو نسبتاً زیادہ کھولنا پڑے۔
ہیولیٰ	کچا نقشہ، خاکہ، شکل، صورت، ساخت
فرامین	فرمان کی جمع بمعنی حکم
نواح	آس پاس، اطراف، قرب و جوار
مرہون منت	ممنون، احسان مند، شکر گزار، احسان تلے دبے ہونا

14.5 نمونہ امتحانی سوالات

14.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ ہند آرائی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

2۔ ہند آریائی کا آبائی وطن کہاں تھا؟

3۔ آریاؤں کی آمد ہندوستان میں کب ہوئی؟

4۔ آریوں کی آمد سے کس زبان کا وجود ہوا؟

5۔ لسانی خاندان کسے کہتے ہیں؟

6۔ ہند آریائی کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

7۔ آریا اپنے ساتھ زبان کے علاوہ کیا لائے تھے؟

8۔ جدید ہند آریائی زبان کا آغاز کب سے مانا جاتا ہے؟

9۔ ویدک سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت عہد کی مقدس کتابوں کے نام کیا ہیں؟

10۔ اپ بھرنش کے کیا معنی ہیں؟

14.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ ہند آریائی اور اردو میں کیا رشتہ ہے؟

2۔ دنیا کی زبانوں کو کتنے لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

3۔ ہند آریائی کا تعلق کس خاندان السنہ سے ہے؟

4۔ سنسکرت کی قدیم شکل کیا ہے؟

5۔ وسطی ہند آریائی کے کتنے ادوار ہیں؟

14.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ اپ بھرنش کسے کہتے ہیں؟ اپ بھرنش کی اقسام بیان کیجیے؟

2۔ ہندوستان میں آریوں کی آمد کب اور کس طرح ہوئی ؟

3۔ ویدک سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت پر نوٹ لکھیے؟

14.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ اردو کا ابتدائی زمانہ شمس الرحمٰن فاروقی

2۔ ہند آریائی اور ہندی سنیتی کمار چٹر جی (مترجم: عتیق احمد صدیقی)

3۔ لسانی مطالعہ پروفیسر گیان چند جین

4۔ ہندوستانی لسانیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

5۔ زبان اور علم زبان پروفیسر عبدالقادر سروری

6۔ اردو زبان کی تاریخ مرتبہ: خلیل احمد بیگ

اکائی 15 : اردو کی ابتدا کے مختلف نظریات

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید
15.1 مقاصد
15.2 اردو زبان، پیدائش اور مختلف نظریات
15.2.1 اردو کے مخلوط یا ملواں زبان ہونے کا نظریہ
15.2.2 اردو کے برج سے پیدا ہونے کا نظریہ
15.2.3 پنجاب اور اردو
15.2.4 سندھ میں اردو
15.2.5 دکن میں اردو
15.2.6 کھڑی بولی اور نواح دہلی کی بولیوں سے اردو کے پیدا ہونے کا نظریہ
15.3 اکتسابی نتائج
15.4 کلیدی الفاظ
15.5 نمونہ امتحانی سوالات
15.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
15.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
15.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
15.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

15.0 تمہید

زبان ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان اپنے جذبات یا خیالات دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہیں تو اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ کسی بھی زبان کے پیدا ہونے اور اس کی نشو ونما میں صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ زبان میں بہت سی تبدیلیاں تاریخی، جغرافیائی، سماجی، ثقافتی اور معاشرتی سطحوں پر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ جب اُس زبان میں ادب تخلیق کیا جانے لگتا ہے، زبان کی اصل ترقی تب شروع ہوتی ہے اور زبان کی باریکیوں پر بھی اہل دانش غور کرنے لگتے ہیں، ساتھ ہی اس میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ زبان کی یہ کاٹ چھانٹ اسے وسیع اور عام فہم بناتی جاتی ہے۔ زبان جتنی آسان اور عام فہم ہوگی اتنی ہی زیادہ قابل قبول ہوگی کیوں کہ کسی بھی زبان کو جکڑ بند

کرنا، زبان کی موت کے مترادف ہے۔ جس زبان کو بھی عوام نہیں بولتی ہے اس کا حلقہ محدود و مسدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس زبان کی ترقی تھم جاتی ہے کیوں کہ جب اس میں نئے الفاظ کی شمولیت نہیں ہوگی اور اس زبان کو برتنے والے ہی کم تعداد میں ہوں گے تو کس طرح وہ زبان دوسری زبانوں کے سامنے خود کو مقابلے میں رکھ سکتی ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی کا انحصار اس کے پھیلنے سے ہے نہ کہ سمٹنے سے، زبانیں زمین کی حدود کو لانگھ کر دوسرے ممالک میں بھی پہنچتی ہیں اور وہاں اپنی شاخ کو ایک وقت آتے آتے قائم کر لیتی ہیں۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبان جس بھی علاقے میں جاتی ہے تو وہاں کی مقامی زبان اور بولیوں سے اثرات قبول کرتی ہے۔ دوسری زبانوں اور بولیوں سے اثرات قبول کرنا ہی زبان کے زندہ رہنے کی علامت سمجھی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر اردو ہی کی بات کریں تو پورے ہندوستان میں اردو کے مختلف علاقائی رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں مثلاً: دہلوی اردو، لکھنوی اردو، دکنی اردو، کلکتیہ اردو، گجری اردو اور کرخن داری اردو وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی ہندوستان کے دیگر خطوں میں اردو کی اور بھی شکلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ تمام اردو زبان ہی کی شاخیں ہیں جن کا سیدھا تعلق اردو سے ہے لیکن ان اردو کی شاخوں پر علاقائی بولیوں اور زبانوں کے اثرات بھی صاف اور واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زبان اور بولیوں کے اثرات کے علاوہ اردو کی ان شاخوں پر بولنے کا لہجہ یعنی الفاظ کی ادائیگی کی تبدیلی، تہذیبی اور ثقافتی اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اور اس طرح یہ شاخیں اپنے اپنے علاقوں میں ترقی پذیر ہوتی آئی ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ یہ شاخیں چاہیں اپنی اصل حالت سے کتنی بھی بدل گئی ہوں اور ان کے لب و لہجے میں بھی جتنا بھی فرق آ گیا ہو لیکن ان کی مماثلت اپنی اصل سے آج بھی بخوبی کی جاسکتی ہے یعنی اس کے اسما، ضمائر، افعال اور مصوطوں کا مطالعہ کرنے پر ان میں یکسانیت ضرور ملے گی۔ مختصر یہ کہ زبان کے پھیلاؤ اور اس کی علاقائی سطح پر ترقی بھی ہوتی ہے اور اس کو قبول کرنے ہی کسی زبان کو بڑا بنایا جاسکتا ہے۔ کسی بھی زبان کو اس کی اصل حالت پر جکڑ بند کر دینے سے اس کا ارتقا بلاشبہ رک جائے گا جس سے اس کی وسیع خطے میں نہیں پھیلایا جاسکتا۔

اردو کی پیدائش کس طرح ہوئی، کن حالات میں ہوئی اور کیوں ہوئی؟ اور اس کی ابتدا میں کون سے وجوہات کارفرما تھے؟ یہ تحقیق طلب سوالات ہیں اور جن کو سمجھنے کے لیے اردو کی قدیم تاریخ اور لسانیاتی کتب سے بہت سے نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ غائر مطالعے کے بعد یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اردو زبان کی پیدائش کو لے کر دانشوران اردو اور ماہر لسانیات نے اپنے اپنے طور پر نظریات بھی پیش کیے۔ یہ الگ بات ہے کہ کون سا نظریہ سب سے زیادہ قابل قبول ہے۔ کسی نے اردو کی پیدائش دراویڑی سے بتائی ہے تو کسی نے ہریانوی سے۔ کسی نے اردو کی بنیاد برج بھاشا کو بتایا ہے تو کسی نے کھڑی بولی کو۔ علاوہ ازیں سندھی اور پنجابی سے اردو کی پیدائش کو لے کر بھی دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ کچھ ادیبوں نے اردو کی ابتدا مختلف زبانوں کے خلط ملط ہونے سے بتائی ہے اور اس لیے انہوں نے اردو کو مخلوط یا ملواں زبان کہا۔ محمد حسین آزاد نے اردو کے متعلق اپنی کتاب 'آب حیات' 1980ء میں لکھا ہے کہا تنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اسی قبیل میں ایک اہم نام مولوی عبدالحق کا بھی آتا ہے جنھوں نے اردو کی ابتدا کے متعلق یہ کہا کہ اردو کی ابتدا ہندو اور مسلم دونوں قوموں کے لسانی، تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس طرح اردو کے متعلق بہت سے نظریات منظر عام پر آئے اور ساتھ ہی اردو کی پیدائش کے متعلق چند خیالات بھی پیش کیے گئے ہیں جن کے پیچھے نہ تو کوئی تحقیق تھی اور نہ ہی کوئی نظریہ سوائے قیاس آرائی کے۔ اس قیاس آرائی کے ذیل میں میرامن کی باغ و بہار سے ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس

خاندان لاثانی کی سن کر، حضور میں آ کر جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔''

(میر امن، باغ بہار، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، 1989ء، ص:۱۲)

اردو کی پیدائش کو لے کر مختلف نظریات کو ادیبوں نے باقاعدہ طور پر مضامین/ کتابیں لکھ کر پیش کیا اور کچھ نے صرف مقولے ہی کہے۔ بہر کیف آئندہ صفحات میں اس موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ اردو کے مختلف نظریات پر معلومات فراہم کی جا سکے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ اردو زبان کی پیدائش کے متعلق ایک صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔
- ☆ اردو زبان کی پیدائش کے متعلق مختلف نظریات اور ان کے تائید اور تردید میں پیش کیے گئے دلائل کی روشنی میں صحیح نظریے تک رسائی حاصل کر سکیں گے اور اس پر بحث بھی کر سکیں گے۔
- ☆ زبان صرف زبان نہیں ہوتی ہے بلکہ تہذیب و تمدن، تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ بھی مختلف علوم اپنے اندر سموئے رکھتی ہے، اس پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- ☆ اردو زبان کی ترقی میں اس کا ادب کتنا معاون ہے اور کیوں؟
- ☆ اردو کا کھڑی بولی سے کیا رشتہ ہے اس پر گفتگو کر سکیں گے۔

15.2 اردو زبان، پیدائش اور مختلف نظریات

اردو کی پیدائش کے متعلق جو بہت سے نظریات دیے گئے ہیں ان میں سے کئی میں ایک خاص بات مشترک ہے جو کہ ایک حد تک درست بھی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے اردو کی ابتدا ہوئی۔ مسلمانوں نے اپنا تسلط دہلی پر 1193ء میں قائم کیا اور ان کی کارگزاریوں اور امور بادشاہی کی وجہ سے سماجی، سیاسی اور تہذیبی سطحوں پر زبانوں کے اختلاط جیسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ دہلی کے شمال مشرق علاقے میں خصوصی طور پر کھڑی بولی رائج تھی جس پر مسلم فاتحین نے خاص توجہ دی اور اپنی رعایا سے رابطے کا ذریعہ اسی بولی کو بنایا۔ جیسا کہ ہوتا ہے کہ جب بولیاں یا زبانیں قریب آتی ہیں تو ان کے الفاظ کا تبادلہ بھی ہوتا ہے اور یہ تبادلہ فطری طور پر ہوتا ہے لیکن مصلحتاً بھی اس پر عمل کیا جاتا ہے تاکہ دو انجان قومیں، فاتح اور مفتوح آپس میں بات چیت کی راہ کو ہموار کر سکیں اور یہ سلسلہ تب تک چلتا ہے جب تک کہ دونوں قومیں یا دونوں زبانیں اس قابل نہ ہو جائیں کہ ایک دوسرے کی زبان کو اچھی طرح سمجھنے نہ لگیں۔ اسی ضمن میں مسلمانوں کے دہلی میں 1193ء میں وارد ہونے کے عمل کو دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ خود تو عربی فارسی اور ترکی بولتے تھے لیکن رعایا سے رابطہ کرنا ہو تو کھڑی بولی کی طرف مائل ہوتے تھے اور رعایا نے بھی عربی، فارسی اور ترکی کی طرف رجوع کیا، حالاں کہ اس دورانیے میں محل کی زبان فارسی ہی رہی اور کھڑی بولی جو آگے چل کر ریختہ کہی گئی کو گرا پڑا ہی تصور کیا جاتا رہا لیکن جو کھڑی بولی میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ کے نفوذ کا سلسلہ جاری رہا جس سے کھڑی بولی بہت سی ایسی آوازوں سے مانوس ہوئی جو اس سے پیشتر دہلی میں

استعمال نہیں ہوتی تھیں، بہر کیف یہ زبان کے پھلنے پھولنے اور وسعت کے مواقع تھے جو اسے مسلموں کی آمد سے میسر آئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی میں عربی، فارسی اور کچھ حد تک ترکی کے اثرات مرتسم ہونے لگے اور ایک نئی زبان کا آغاز ہوا جسے مسلمانوں نے ہی 'ہندی' اور 'ہندوی' کا نام دیا لیکن اسے ابھی وہ وقار حاصل نہیں ہو سکا تھا جو فارسی کو حاصل تھا کیوں کہ اعلا طبقہ فارسی بولتا تھا کیوں کہ درباری زبان فارسی تھی اور اردو جو ابھی بہت کچی حالت میں تھی اور اس کے ادبی نمونے بھی سامنے نہیں آئے تھے، یہ بس عوام کی زبان تھی۔ اسی نئی زبان کو جو کھڑی بولی سے نئی کونپل کی طرح پھوٹ رہی تھی کو 'ریختہ' اور 'دہلوی' جیسے ناموں سے بھی جانا گیا۔ اردو کا ڈھانچہ تو پہلے ہی کھڑی بولی اور اس میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ کے داخل ہونے سے تیار ہو گیا تھا جو وقت کے ساتھ مزید نکھرتی گئی اور زمانے کی تاریخی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے استفادہ کرتے ہوئے خود کو مزین کرتی رہی اور اردو کی شکل میں نمودار ہوئی۔

اردو ایک ہند آریائی زبان ہے اور اسی سے نکلی ہے۔ اردو کی ابتدا کو سمجھنے کے لیے اختصار کے ساتھ پہلے ہند آریائی کا جائزہ لیا جائے گا تا کہ اندازہ ہو سکے کہ کس کس طرح ہند آریائی سے ایک لمبی مدت کے بعد اردو وجود میں آئی۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں آریا قوم وسطی ایشیا میں آباد تھے اور بعد میں وہ ایشیائے کوچک میں چلے گئے۔ وہاں سے بھی نکل کر وہ 2500 ق م میں ایران چلے گئے اور ایران کو اپنا وطن بنایا اور کچھ وقت قیام کے بعد 1500 ق م میں ہندوستان کے خطۂ پنجاب میں پہنچے۔ تب سے لے کر آج تک یہ قوم ہندوستان میں آباد ہے اور اس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زبان میں بہت سی تبدیلی واقع ہوتی گئی جب کہ ابتدا میں ان کی زبان پر ایرانی کے اثرات بہت گہرے تھے کیوں کہ آریاؤں نے ایران میں کم و بیش ایک ہزار سال کا عرصہ گزارا تھا جو ان کا وطن بھی تھا۔ ہندوستان میں آنے پر ان کی زبان کی تبدیلی ہی ایک نئی زبان کی بنیاد بنتی گئی اور اس نئی زبان کو دانشوروں نے ہند آریائی کے نام سے موسوم کیا۔

ہند آریائی میں وقتاً فوقتاً اپنا روپ بدلا اور اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔ ہند آریائی کا زمانہ 1500 ق م سے 500 ق م تک تصور کیا جاتا ہے۔ یہی دور آریاؤں کی قدیم زبان سنسکرت کا دور کہلاتا ہے اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں آریاؤں کے پھیل جانے سے سنسکرت کے مختلف روپ نمودار ہونے لگتے ہیں۔ سنسکرت زبان کے سب سے اہم اور پہلے قواعد نویس کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ بہر کیف سنسکرت کی جو اہم تین شکلیں نمودار ہوئیں جن میں سے آگے چل کر اردو کے لیے ماحول تیار ہوتا ہے وہ ہیں:

1۔ ادیچیہ　　2۔ مدھیہ دیشہ　　3۔ پراچیہ

مذکورہ بالا سنسکرت کی تینوں شاخیں پورے ملک میں اپنے اپنے علاقوں میں پھلنے پھولنے لگیں اور ایک مدت کے بعد ان میں علاقائی تبدیلیاں اور اضافے ہوتے رہے۔ اسی کے ساتھ ہی وہ قدیم سنسکرت کی تینوں شاخیں پراکرتوں میں تبدیل ہونے لگیں اور پانچ پراکرتیں وجود میں آ گئیں جن کے نام یوں ہیں:

1۔ مہاراشٹری پراکرت

2۔ پشاچی پراکرت

3۔ شورسینی پراکرت

4۔ ماگدھی پراکرت

5۔اردھ ماگدھی پراکرت

ان پانچوں پراکرتوں کا نام ان کے خطوں/ علاقوں کے ناموں کی وجہ سے پڑا جس سے ہندوستان کے نقشے کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ کون سی پراکرت ہندوستان کے کس خطے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مہاراشٹری پراکرت جس میں تخلیق کیا ہوا ادب بہت ہی اہم مانا جاتا ہے اس کا علاقہ موجودہ صوبہ مہاراشٹر کے علاوہ کچھ دکن کے حصوں تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ پچاسی پراکرت کے علاقے میں کشمیر اور پنجاب کا شمار ہوتا ہے۔ شورسینی پراکرت متھرا (اتر پردیش) سے تعلق رکھتی ہے جہاں برج زبان کی اپنی ان پراکرتوں میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں اور علاقائیت کا اثر ان پراکرتوں پر پڑتا رہا اور اس طرح یہ پراکرتیں اپ بھرنشوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ ماگدھی کا علاقہ مشرقی اتر پردیش سے شروع ہوکر بہار کے اختتام تک پھیلا ہوا تھا اور کچھ حد تک بنگال بھی اس کے حدود میں داخل تھا۔ اردھ ماگدھی کا علاقہ جنوبی بہار سے لے کر دور جنوب تک کے علاقے پر محیط تھا۔ اپ بھرنشوں میں سب سے اہم نام شورسینی اپ بھرنش کا ہے کیوں کہ اردو ہندی کا تعلق اسی سے ہے۔ ہند آریائی تغیر و تبدل کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد جب وسطی ہند آریائی کے آخری مرحلے میں پہنچتی ہے تو اپ بھرنش کا روپ دھار لیتی ہے جس کا علاقہ مدھیہ دیش کہلاتا ہے ہندوستان کے وسیع خطے پر محیط ہے یعنی امبالہ تا الہ باد کا علاقہ Midland یعنی مدھیہ دیش کہلاتا ہے۔ دوآبہ گنگ وجمن کی سرزمین اسی خطے میں ہے۔ 1000ء تک پہنچتے پہنچتے لسانی تبدیلیوں کے وجوہات کی بنا پر شورسینی اپ بھرنش سے کئی طرح کی بولیوں کے تخم جڑ پکڑنے لگتے ہیں جن میں سے ایک بولی کھڑی بولی کے نام سے جانی جاتی ہے لیکن بولیوں کے پھوٹنے کا یہ سلسلہ اتنا سیدھا نہیں ہے بلکہ اس میں کئی تہیں ہیں۔ کھڑی بولی تک پہنچنے سے پہلے شورسینی اپ بھرنش سے اہم زبانیں پھوٹتی ہیں ملاحظہ فرمائیں:

1۔سندھی

2۔پنجابی

3۔راجستھانی

4۔مشرقی ہندی

5۔مغربی ہندی

شورسینی اپ بھرنش سے جو بہت ہی اہم پانچ بولیاں وجود میں آئیں ان میں بھی مشرقی ہندی کو زیادہ توجہ دی گئی کیوں کہ آگے چل کر اسی سے کھڑی بولی پھوٹتی جو اردو کی بنیاد بنتی ہے۔ کھڑی بولی کے علاوہ بھی دیگر زبانیں منظر عام پر آتی ہیں۔ ان پانچوں زبانوں میں سے مغربی ہندی سے پانچ اور بولیاں وجود میں آئیں:

1۔ہریانوی

2۔برج

3۔قنوجی

4۔بندیلی

5۔کھڑی بولی

شور سینی اپ بھرنش کی جاں نشین مغربی ہندی سے پیدا ہوئی کھڑی بولی اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں کی ماں کہی جاسکتی ہے۔قدیم اردو پر کھڑی کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں پھر وہ چاہے امیر خسروؔ کا تخلیق کردہ کلام ہو یا دیگر ادیبوں کا کلام ہو اس پر کھڑی بولی کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔اسی طرح ہندی ادب پر کھڑی کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔کھڑی بولی کو سب سے پہلے مسلم ادیبوں نے اس قابل سمجھا کہ اس میں ادب تخلیق کیا اور دھیرے دھیرے اظہار خیال کی یہ گری پڑی اور کچی زبان جو ریختہ کے نام سے منسوب تھی ملک کی اہم زبان بن کر ابھری اور مغلوں کے زمانے میں ہی اس نے اپنی شناخت بنالی تھی۔پھر بعد میں انگریزی حکومت میں اسے 1832ء میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت اردو اتنی ترقی یافتہ زبان بن گئی تھی کہ اسے سرکاری زبان بنایا جاسکے۔اس کے پیچھے ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اُس وقت تک اردو ملک گیر سطح پر عوام میں رائج ہوچکی تھی اور اپنی جگہ بنا چکی تھی۔دکن اور مہاراشٹر کے دور دراز کے علاقوں میں بھی ان کی اپنی علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو پڑھی اور سمجھی جاتی تھی۔

اردو کے کھڑی بولی سے پیدا ہونے کا نظریہ جو اب تک کا سب سے قابل قبول نظریہ ہے حالاں کہ دیگر نظریات بھی بڑے دلائل کے ساتھ پیش کیے گئے لیکن ان کی تردید کے بعد کھڑی بولی کو ہی اردو کا اصل منبع مانا گیا۔پروفیسر مسعود حسین خان کے مطابق کھڑی بولی کے علاوہ بھی دیگر زبانوں اور بولیوں کا اردو کی پیدائش میں تعاون رہا ہے۔کھڑی بولی پر اس کے اطراف سے ہریانوی، میواتی اور برج بھاشا کے اثرات مرتب ہوتے گئے۔اسی کھڑی بولی کے ابتدائی مراحل میں ہی عربی اور فارسی کے الفاظ کا نفوذ بھی ایک اہم واقعہ ہے اور جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اردو کو اس کا رسم الخط فارسی اور عربی سے ہی ملا ہے اور ایسا دہلی پر مسلم فاتح کے داخلے کے بعد ہی ممکن ہوا۔بلاشبہ کھڑی بولی اپنے مخصوص علاقے میں ترقی پذیر ہوتی لیکن اردو کو نئی آوازیں، لب ولہجہ اور اس کا رسم الخط عربی فارسی سے ہی ملا ہے۔

15.2.1 اردو کے مخلوط یا ملواں زبان ہونے کا نظریہ

اردو کے ملواں زبان ہونے کی بات واضح طور پر اور سب سے پہلے میر امن نے کہی۔انہوں نے اپنی کتاب ’باغ و بہار‘ 1803ء میں اردو کے مخلوط یا ملواں زبان ہونے کی بات لکھی ہے۔بلاشبہ میر امن کوئی ماہر لسانیات نہیں تھے اور نہ ہی اس وقت تک اردو میں ایسی شدھ بدھ پیدا ہوئی تھی کہ جدید پیمانوں پر اردو کی پیدائش کو جاننے کے لیے تحقیق کی جاتی۔اردو تو اس وقت تک بھی عوام کی زبان تھی جس پر فارسی کا غلبہ تھا۔تو ایسے میں میر امن سے کسی ماہر لسانیات کی طرح تحقیق کے بعد اپنی بات کہنے کی امید نہیں رکھنی جیسا کہ ہمارے بہت سے محققین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔بے شک وہ ماہر لسانیات نہیں تھے لیکن اپنے طور پر جو بھی لکھا وہ قابل توجہ ضرور ہے بلکہ اردو کے آغاز کے بیشتر نظریات کو پیش کرنے سے پہلے پرانے نظریات یا مقولوں پر بھی غور کرنا پڑتا ہے پھر چاہے ان میں ذرہ برابر بھی صداقت نہ ہو۔میر امن کی تحریر سے بھلے ہی تحقیق کی کوئی راہ نہ کھلتی ہو لیکن یہ باور ضرور ہو جاتا کہ اردو کی ابتدا میں مسلم سلطانوں اور بعد میں مغل بادشاہوں کا گدی نشین ہونا اردو کے لیے نیک شگون ثابت ہوا کیوں کہ میر امن اپنی تحریر میں لکھتے ہیں اکبر بادشاہ کے گدی نشین ہونے پر مختلف علاقوں اور ممالک سے بہت سے لوگ آکر درباری اور دلی میں جمع ہو گئے تھے۔فوج میں شامل بیشتر سپاہی بھی ایرانی اور ترکی نسل کے تھے۔ان سب کے لیے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔بلاشبہ زبان مقرر نہیں کی گئی تھی البتہ یہ سچ ہے کہ مختلف النسل کے لوگ دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ان کی زبانیں بھی علیحدہ تھیں۔اردو کا حسن بھی اسی بات پر قائم ہے کہ اس میں کئی زبان و کے الفاظ کو دیکھا جاسکتا ہے۔میر امن نے اردو کی پیدائش کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی کہ جب اکبر بادشاہ گدی نشین ہوئے تو چاروں طرف کے ممالک سے

بہت سے لوگ فیض اٹھانے کے لیے دہلی میں جمع ہوئے اور سب کی زبان جدی جدی (جدا جدا) تھی۔ وہ سب اکٹھے ہو کر آپس میں سودا سلف اور سوال و جواب کا معاملہ کرتے تھے تو ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔ میر امن کا اقتباس مضمون کے شروع میں ہی دیا جا چکا ہے جس سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ میر امن نے یہ بات سرسری طور پر اپنے علم کے مطابق 'باغ و بہار' میں لکھ دی تھی جس کا تحقیق سے تعلق نہیں ہے لیکن تحقیق کے لیے راستہ ضرور مل جاتا ہے۔

اسی قبیل میں امام بخش صہبائی نے فارسی اور ہندی زبان کے الفاظ کے خلا ملا کی بات کہی جسے حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں نقل بھی کیا ہے۔ اردو کے متعلق صہبائی کا نظریہ کسی دلیل پر مبنی نہیں تھا۔ یہ بھی ایک مفروضے سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا لیکن ابتدا میں انہیں نظریات کی وجہ سے اردو کی پیدائش کا بھرم قائم تھا جو نئی تحقیق اور مطالعہ کی مدد سے ٹوٹا اور اردو کی ابتدا کے نئے نظریات سامنے آئے، جن میں سب سے زیادہ مقبولیت مسعود حسین خان کے نظریے کو ملی۔

مولوی عبدالحق نے ہندو اور مسلم دونوں قوموں کے آپسی میل جول، اتحاد اور تہذیب و تمدن کے لین دین کی وجہ سے اردو کے وجود میں آنے کی بات کہی۔ بہر کیف اردو کے خلا ملا، مخلوط، کھچڑی یا ملواں زبان ہونے پر اور کئی دانشوروں نے اپنی اپنی آرا پیش کی ہیں لیکن ان کو تحقیق سے علاقہ نہیں اس لیے انہیں کچھ ہی وقت کے بعد مسترد بھی کیا جانے لگا۔

15.2.2 اردو کے برج سے پیدا ہونے کا نظریہ

اردو کے برج سے پیدا ہونے کا نظریہ بھی ایک وقت میں خاصا مشہور ہوا۔ اردو کے برج سے پیدا ہونے کی بات کئی دانشوروں نے کہی یا اپنی کتابوں میں لکھی لیکن یہ نظریہ محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' 1880ء سے زیادہ مشہور ہوا۔ محمد حسین آزاد حتمی فیصلہ سناتے ہوئے اردو کے متعلق اپنی کتاب 'آب حیات' میں لکھتے ہیں کہ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا ہی خاص ہندوستانی زبان ہے۔ آزاد کی شہرت اس نظریے کی وجہ سے بھی ہوئی تھی اور ایک وقت تک یہ تصور کیا جاتا رہا کہ اردو زبان برج سے نکلی ہے۔ آزاد کی تحریر کو پڑھ کر صاف طور پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ بات محض لفظی جمع خرچ ہے اس میں کوئی تحقیق، منطق یا دلیل ہرگز پیش نہیں کی گئی ہے۔ اردو کے برج بھاشا سے پیدا ہونے کا نظریہ حالاں کہ آزاد کی وجہ سے بہت مشہور ہوا لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ اردو کے برج بھاشا سے پیدا ہونے کا نظریہ سب سے پہلے ہند آریائی لسانیات کے ماہر روڈولف ہیورنلے نے متعارف کرایا تھا۔ آزاد اور ہیورنلے کے کافی بعد میں سید شمس اللہ قادری نے اپنے رسالے 'تاج اردو' میں بھی اردو کے برج سے پیدا ہونے کی بات لکھی۔ برج بھاشا سے اردو کی ابتدا کے بارے میں جو مختلف دانشوروں کی آرا ملتی ہے ان میں ایک بات ضرور مشترک ہے وہ یہ کہ برج بھاشا میں عربی اور فارسی کے الفاظ شامل ہوتے گئے یا برج بھاشا کی مدد سے دو تہذیبیں یا قومیں قریب آئیں جس سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جسے اردو کہا گیا۔

اردو صرف برج بھاشا کی جانشین تو کبھی نہیں رہی کیوں کہ اس کا کینڈا کھڑی بولی سے مماثل ہے جو آگے چل کر ثابت بھی ہوا، ہاں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ کھڑی بولی پر برج کے اثرات لمبے وقت تک پڑتے رہے اور اردو کی ابتدا میں برج کا بھی اہم رول رہا ہے۔ اردو کی ابتدا میں برج کا تعاون ایک بات ہے لیکن اردو کھڑی بولی سچی جانشین ہے یہ بات اردو اسما اور ضمائر سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے، قواعد اور جمع بنانے کے طریقوں سے بھی۔ اسی لیے کھڑی بولی سے نکلنے والی دونوں زبانیں یعنی ہندی اور اردو کے اسما، ضمائر اور جمع بنانے کے طریقوں میں یکسانیت ہے۔

15.2.3 پنجاب اور اردو

پنجاب میں اردو کا نظریہ حافظ محمود خان نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' 1928 میں پیش کیا ہے جسے آج بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ کچھ دانشور اردو کی جائے پیدائش اب بھی پنجاب ہی کو مانتے ہیں۔ اردو کی ابتدا پنجاب میں ہوئی اس کے پیچھے جو تاریخی واقعات پیش کیے گئے ہیں ان کا تاریخ سے تو گہرا تعلق ہے لیکن اردو کی ابتدا سے نہیں۔ امیر سبکتگین کے بیٹے محمود غزنوی نے ہندوستان پر متواتر حملے کیے جس کے نتیجے میں اس کا لاہور پر تسلط قائم ہوگیا۔ لاہور کو اپنی حکومت میں شامل کر کے اور ایک ترکی حاکم کو وہاں کا نگہبان بنا کر وہ خود غزنہ چلا گیا اور جہاں 1030ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ حکومت کے بعد مسلمان پورے پنجاب میں پھیل گئے اور اہل پنجاب اور سے ان کے مراسم بھی پیدا ہوگئے۔ ہر محکوم قوم اور فاتح قوم میں زبان و بیان، تہذیب و تمدن، لباس اور کھان پان کا فرق ضرور ہوتا ہے لیکن یہ خلا بھی دھیرے دھیرے پر ہوتا گیا۔ اس تاریخی واقعے کے مطالعے کے بعد حافظ محمود خاں شیرانی اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلم فاتح جب محمود غزنوی کے ساتھ پنجاب میں داخل ہوئے تو عربی کے بجائے فارسی بولتے ہوئے داخل ہوئے تھے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ محمود غزنوی کا تعلق ترکی نسل سے تھا لیکن ایران سے بھی اس کا گہرا تعلق تھا۔ فارسی اور پنجابی کے زبانوں کے میل جول، پھر دو قوموں کے اشتراک سے جو زبان وجود میں آئی وہ اردو تھی اور محمود شیرانی کے نزدیک اردو پنجاب سے ہی دہلی پہنچی اور اہل دہلی میں آگے چل کر مقبول ہوئی۔

حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب میں اس بات کا انکشاف تو دلائل کے ساتھ کیا کہ اہل پنجاب نے دہلی کے لیے ہجرت کی اور اس طرح اردو ان کے ساتھ دہلی پہنچی اور وہاں جا کر اس کی ترقی اور ترویج ہوئی۔ ساتھ ہی شیرانی صاحب نے اس کے تذکیر و تانیث، جمع واحد، افعال کی مماثلت کو بھی بہت مضبوط دلائل کے طور پر پیش کیا ہے۔

ان دلائل کی تردید مسعود حسین خان نے اپنی تحقیقی کتاب 'مقدمہ تاریخ زبان اردو، 1987 میں کھل کر کی ہے۔ پنجابی اور اردو میں جو مماثلت دلیل کے طور پر محمود شیرانی نے پیش کی ہیں اسی طرح کی مماثلت اردو سے دکنی اردو اور ہریانوی کی بھی ہے۔ ہریانوی اور پنجابی میں بھی جمع اور افعال بنانے کے طریقے یکساں ہیں۔ اس بنا پر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اردو اور پنجابی میں یکسانیت ہے اور اردو پنجابی سے نکلی ہے۔ حالاں کہ اردو کے پنجابی سے نکلنے کی بات ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور سرخوش نے بھی کی تھی بلکہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے تحقیق کر کے اپنی کتاب ہندوستانی لسانیات میں کی ہے۔

15.2.4 سندھ میں اردو

اردو کے وادیِ سندھ میں پیدا ہونے کا نظریہ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب 'نقوش سلیمانی' 1939 کے ذریعے دیا۔ عام طور پر اردو زبان کی پیدائش کو لے کر کسی دعوے دار کے پاس ٹھوس دلائل نہیں ملتے ہیں بلکہ ان کا خیال قیاس پر مبنی ہوتا ہے، ایسا ہی سید سلیمان ندوی کے خیال سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ موصوف کے نزدیک سندھ میں اردو کی ابتدا اس لیے ہوئی کیوں کہ پہلے پہل مسلمان عرب سے سندھ 711ء میں پہنچے تھے۔ اس زمانے میں سندھ کا راجا داہر تھا۔ عربوں نے پہلے دیول کے قلعے کو فتح کیا اور پھر دھیرے دھیرے پورے سندھ کو اسلامی حکومت کا حصہ بنا لیا۔ عرب سے ایک باصلاحیت جنگجو اور سپہ سالار محمد بن قاسم کی قیادت میں بری و بحری راستوں سے 711ء میں سندھ میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے سندھ پر نہ صرف فتوحات حاصل کیں بلکہ وہاں پر لمبا وقت گزارا اور تین سو سال سے زائد کا وقفہ وہیں پر گزارا۔ اس طرح سندھی اور عربی

قوم کے درمیان جو سماجی روابط پیدا ہوئے اس نے وہاں ایک نئی زبان کے ڈھانچے کو تیار کیا لیکن وہ نیا ڈھانچہ اردو کا تو ہرگز نہیں تھا۔ اسی میل جول سے پیدا ہوئی زبان کو سید سلیمان ندوی صاحب اردو کہتے ہیں۔ چوں کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے تھے اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اردو کا ہیولا اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔ سندھ میں سب سے پہلے عربوں یعنی مسلمانوں کا داخل ہونا اردو کی ابتدا کی ضمانت نہیں ہوسکتی کیوں کہ سندھ کی مقامی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ نفوذ کرتے رہے لیکن نئی بننے والی یا یوں کہیں کہ متاثر ہونے والی زبان اردو کی شکل میں ہرگز نہیں تھی۔ اردو کا کینڈا یا ڈھانچہ کھڑی بولی پر مبنی ہے نہ کہ سندھی پر۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سندھ زبان سے یا وادیِ سندھ میں اردو کی داغ بیل نہیں پڑی۔

سید سلیمان ندوی نے کوئی بھی ایسی دلیل نہیں دی جس سے ان کی بات کی صداقت پر یقین کر لیا جاتا بلکہ خود بھی اپنی بات کو قیاس کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ مسلمان سب سے پہلے وادیِ سندھ میں وارد ہوئے اور وہاں کی تہذیب وتمدن اور زبان و بیان کو بھی بہت متاثر کیا حتی کہ عربی کے بہت سے الفاظ وہاں کی زبان میں شامل ہوتے گئے لیکن اردو کے بجائے سندھی کی بنیاد پڑی۔ آج بھی سندھی زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا اور سندھی نے عربی رسم الخط بھی اختیار کر لیا اور اس طرح سے سندھی زبان وجود میں آئی۔ سید سلیمان ندوی کی قیاس آرائی اور لسانیاتی قوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے سندھ میں کوئی نئی زبان کی بنیاد نہیں ڈالی البتہ اپنی زبان اور تہذیب وتمدن سے اہل سندھ کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ان کی زبان میں بھی عربی الفاظ بہت گہرائی تک سرائیت کر گئے۔ اس طرح قدیم سندھ میں بولی جانے والی زبان کا روپ بدل گیا۔ سید سلیمان ندوی کا خیال صرف قیاس آرائی پر مبنی ہے اس میں کوئی بھی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اردو سندھ میں پیدا ہوئی۔ اس لیے یہ بات بڑے ہی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ عربی فارسی نے سندھی زبان کو بہت حد تک متاثر ضرور کیا تھا لیکن کسی بھی دور میں سندھی میں کھڑی بولی سے مماثل نہیں پائی گئی۔ سید سلیمان ندوی کے نظریے کو زیادہ اہمیت اسی لیے حاصل نہ ہو سکی کیوں کہ موصوف کا نظریہ نہیں تھا بلکہ محض قیاس آرائی تھی جس کا تحقیق سے دور دور تک کوئی واسطہ نظر نہیں آتا اس لیے اس نظریے کی بھی تردید ہوئی اور قابل قبول نہیں رہا البتہ اس نظریے کے پیچھے جو تاریخ بیان کی جاتی ہے اس میں صداقت ہے۔

15.2.5 دکن میں اردو

اردو کے دکن میں پیدا ہونے کا نظریہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اردو' 1923ء میں پیش کیا۔ اس نظریے کی بنیاد بھی فاتح اور مفتوح قوموں کا آپس میں اختلاط ہی بتایا گیا ہے جس میں کچھ خاص دلائل نہیں دیے گئے ہیں۔ اس کا تاریخی پس منظر یوں ہے کہ علاء الدین خلجی نے دکن کے علاقے دیوگری میں اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ حملہ کیا اور وہاں کے راجا کو شکست دے دی۔ راجا نے اس سے صلح کر لی۔ علاء الدین خلجی نے وہاں سے آنے کے بعد اپنے چچا سلطان جلال الدین خلجی کا قتل کیا اور خود گدی پر بیٹھ گیا۔ جب وہ سلطان بنا اور دہلی کی گدی پر بیٹھا تو اس نے اپنے سپہ سالار ملک کافور کو دکن بھیجا اور کئی حملے کیے اور دیوگری کے علاوہ بھی دکن کے کئی علاقوں میں حکومت قائم کر لی۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے بیٹے محمد جونا عرف الغ خاں کے ساتھ شاہی فوجوں کو دکن کے لیے روانہ کیا اور متواتر کئی حملے کیے اور محض تین سال کی مدت میں پورے دکن پر تسلط قائم کر لیا۔ محمد جونا جب سلطان بنا تو اس نے اپنی حکومت کی حفاظت، باہری حملوں کو روکنے اور دشمنوں کو زیر کرنے کے مقصد سے دار الخلافہ کو 1327 میں دہلی سے دولت آباد یعنی دیوگری میں منتقل کیا۔ اہل دہلی کو بھی دولت آباد کو آباد کرنے کا حکم صادر ہوا تھا شاہی حکم کے

خلاف رعایا تو جا نہیں سکتی تھی اس لیے سب نے شاہی حکم کو مانا اور دہلی کی بیشتر آبادی دولت آباد روانہ ہوگئی اور وہیں جا کر بس گئی۔ دہلی سے اہل علم و ہنر کے علاوہ، صنعت کار اور بزرگان دین اور عالموں کی بھی ایک کثیر تعداد دکن میں پہنچی تھی۔ وہ جو زبان اپنے ساتھ لے گئے تھے اسی میں وہاں گفتگو کرتے تھے اور وہاں کی عوام نے بھی بول چال کے لیے اہل دہلی کی ہی زبان کو اختیار کیا۔ اردو جو ابھی کچی حالت میں تھی اب دولت آباد میں اس کی پرورش ہونے لگی۔ وہاں کی عوام اور خود دہلی سے گئے ہوئے اہل علم و ہنر نے اسی کچی زبان میں ہی اپنے کاروبار شرع کیے۔ صوفیائے کرام نے بھی اپنے اقوال اور ملفوظات اسی کھڑی بولی پر مبنی دہلوی اردو میں ہی رقم کیے یا ان کے مریدین نے لکھے جس سے اردو کے ابتدائی نقوش ادبی کتب اور دستاویز کی شکل میں آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

زبان کے فروغ کے ضمن میں ایک بات اور مشہور ہے بلکہ حقیقت سے قریب ہے کہ علما، بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی ہزاروں پالکیاں سرزمین دکن پر پہنچی تھیں۔ صوفیائے کرام نے علم دین کا درس گھوم گھوم کر دیا اور خانقاہیں قائم کیں جن میں اسلام کی تبلیغ، خدا کی وحدانیت اور روحانیت کا درس دیا جاتا تھا۔ اس ذیل میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی بڑی ہی اہم کتاب 'اردو زبان کے ارتقا میں صوفیائے کرام کا حصہ' میں بہت سے بزرگان دین اور صوفیائے کرام اور ان کے ذریعے دیے گئے درس کو نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس میں بہت سے بزرگوں کا نمونہ کلام پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت اسلام کی تبلیغ کو ابتدائی اردو یا ریختہ میں فروغ دیا گیا اور ایک سطح پر اردو کو ان تبلیغوں سے بھی فائدہ پہنچا اور اردو کے ارتقا میں صوفیائے کرام نے اپنا کردار ادا کیا۔ دوسری طرف اہل علم اور صنعت کاروں نے بھی وہاں کے پرانے باشندوں کو زبان ہی نہیں بلکہ تہذیبی سطح پر بھی متاثر کیا۔ دکن کے باشندوں نے بھی دہلی سے آئی ہوئی اس نئی زبان کو سیکھنے میں دلچسپی دکھائی اس کی وجہ یہ تھی کہ زبان سیکھ کر ملازمت یا دیگر کاروباری امور میں فائدہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ کارگزاریاں اردو کے ارتقا کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئیں۔

یہ سلطان کی اپنی سوجھ بوجھ تھی یا اس کے مشیروں اور خیر خواہوں کی لیکن کچھ ہی عرصے بعد اسے احساس ہو گیا کہ پایۂ تخت کو منتقل کرنا اس کی بہت بڑی غلطی تھی اور نتیجے کے طور پر اس نے دہلی کو دوبارہ سے پایۂ تخت بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس بار شاہی فرمان میں یہ چھوٹ تھی کہ جو خاندان چاہے تو وہ دہلی جائے اور جو نہ چاہے وہ وہیں رہ سکتا تھا۔ اس طرح بہت سے دہلوی خاندان وہیں رک گئے اور زبان دہلی کی ترقی ہوتی رہی۔ 1347 میں جب گلبرگہ میں خود مختار بہمنی سلطنت کا قیام عمل میں آیا تو یہ واقعہ اردو کے لیے بہت اہم ثابت ہوا۔ نئی بنی حکومت میں امور شاہی اور دیگر کام بھی اردو میں کیے جاتے تھے۔ جب بہمنی سلطنت ٹوٹ کر پانچ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی تو اردو کی ترقی اور بھی بڑے پیمانے پر ہوئی۔ جس میں عادل شاہی سلطنت، بیجاپور اور قطب شاہی سلطنت، گول کنڈہ کے سلاطین نے اردو کی ترقی کے لیے باقاعدہ شاعر اور نثر نگاروں کو اپنے دربار میں جگہ دی۔ علاوہ ازیں ان دونوں سلطنتوں کے کئی سلاطین خود بھی شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان دونوں سلطنتوں میں دکنی اردو کی بہت اہم کتابیں لکھی گئیں جو آج بھی ادبی، تاریخی اور مذہبی لحاظ سے بہت معیاری سمجھی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر آمنہ خاتون نے 'دکنی کی ابتدا' 1970 کے نام سے ایک کتابچہ لکھا تھا جس میں انھوں نے دکنی کو ایک الگ ہی زبان ثابت کرنے کی سعی کی تھی لیکن وہ اپنے خیال کی ترویج میں کوئی مستند حوالے نہیں دے سکیں۔ ان کا عندیہ یہ تھا کہ مرہٹی زبان میں عربی فارسی کے الفاظ کی آمیزش سے دکنی کی ابتدا ہوئی۔ یہ سلسلہ اردو کے دکن پہنچنے سے بھی 500 سال پہلے سے شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کا یہ نظریہ اس لیے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا کیوں کہ دکنی کو انھوں نے ایک الگ ہی زبان تصور کیا جو کہ ان کے نزدیک دہلوی اردو کے دکن پہنچنے سے وجود میں نہیں آئی۔ علاوہ ازیں انھوں

نے اردو کی ابتدا کے سارے نظریات کو رد کرتے ہوئے صرف دکنی کے دکن میں پیدا ہونے پر زور دیا۔ دکنی اور دہلوی زبانوں میں لہجے کا فرق تو تھا ہی اور الفاظ بھی کچھ جدا تھے لیکن ڈھانچہ دونوں کا اسی کھڑی بولی سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ہریانوی سے بھی یہ مماثلت دیکھی جا سکتی ہے تو ایسے میں یہ کہنا کہ دکنی اپنے آپ میں الگ زبان ہے توجہ کا حامل نہیں ہو سکتا کیوں کہ کسی بھی زبان کی شناخت اس زبان سے ملتی جلتی زبان کے اسما، ضمائر، افعال اور مصوتوں کی یکسانیت پر بھی مبنی ہوتی ہے۔ اس پیمانے پر دکنی اردو کا سلسلہ کسی دراویڑی زبان سے نہیں بلکہ دہلوی اردو یا یوں کہیں کہ کھڑی بولی سے جا ملتا ہے۔

بلاشبہ اردو اپنی ابتدائی حالت میں یا یوں کہیں کہ کچی حالت میں دکن گئی تھی اور وہاں سے مختلف سطحوں پر ترقی یافتہ ہو کر کے واپس دہلی اور ہندوستان کے دوسرے خطوں میں پہنچی لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہو جاتا کہ اردو کی ابتدا دکن میں ہوئی کیوں کہ اردو کی ابتدائی صورت دکن جانے سے پہلے ہی وجود میں آ چکی تھی اور امیر خسروؒ جیسے عظیم شاعر نے اسی ابتدائی اردو میں جس میں برج بھاشا کی شمولیت بھی تھی، شاعری اور دیگر کتابیں لکھی تھیں۔ ولی دکنی کا سفر دہلی (1700) ء ایسا واقعہ ہے جس نے اردو ادب کا رخ ہی موڑ دیا۔ ایسا نہیں ہے کہ ولی کے شمالی ہند میں آنے سے پہلے شمال میں اردو ادب تخلیق نہیں کیا جا رہا تھا، ادب تخلیق کیا جا رہا تھا لیکن اس پر فارسی کا غلبہ تھا۔ اعلا طبقہ فارسی کے علاوہ اردو استعمال کرنے میں کسرِ شان سمجھتا تھا اور امور شاہی بھی فارسی میں ہی انجام پذیر ہو رہے تھے ایسے میں اردو زبان کو محل کی زبان کیسے تسلیم کیا جاتا۔ ولی دکنی کو محمد حسین آزاد نے اردو کا چاسر (Chaucer) کہا ہے اس سے ان کی اردو ادب میں اہمیت اور درجے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد سے بھی پہلے میر اور غالب کے اشعار سے بھی ولی دکنی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہاں اشعار سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ اردو شاعری کے بابا آدم تھے اور انہوں نے ہی پہلے پہل اہل دہلی کے سامنے اپنا عندیہ پیش کیا کہ جس زبان کو آپ گرا پڑا سمجھتے ہو اس میں بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے، اس میں ابھی اعلا خیالات کو شاعری کے قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ یہ تاریخی سفر اردو ادب کے لیے بہت ہی بابرکت ثابت ہوا اور ایک نئی تحریک کی بنیاد پڑ گئی اور لوگ ریختہ یعنی اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے اور اردو ادب کے ارتقا پذیر ہونے سے ایسا ماحول تیار ہوا جس نے آنے والے وقت میں صاف اور شستہ اردو کے ادیب پیدا کیے۔ ان ادیبوں نے اردو ادب کو وہ شاہ کار عطا کیے کہ جن کا ذکر تا دیر قائم رہے گا۔ میر تقی میر کی شاعری، میر امن کی باغ بہار اور مرزا غالب کے خطوط ایسی کتابیں ہیں جن کی سادگی، سلاست اور تخلیقیت پر آج بھی مداح اپنا سر جھکاتے ہیں، مختصر یہ کہ یہ درجہ ولی دکنی کی وجہ سے اردو کو حاصل ہوا البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو دہلی میں پہلے ہی تھی بس اس کے شاعری کے لیے استعمال پر ولی دکنی نے ترغیب دلائی۔ دوسری طرف یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ دکن کے علاوہ شمالی ہند میں بھی اردو کی ترقی رکی نہیں تھی البتہ مغلوں کے زمانے میں بھی عوام کی زبان اردو ہی رہی جس کی بنیاد کھڑی بولی پر تھی ہاں سرکاری کام اور اعلا طبقہ فارسی بولتا تھا۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ دکنی میں بھی اردو دہلی سے گئی تھی جو بعد میں مزید نکھرتی گئی اور دکن کا لب و لہجہ اختیار کر کے دکنی کہلانے لگی اور وہی زبان جب گجرات پہنچی تو گجری کے نام سے بھی موسوم ہوئی۔ زبانوں کے علاقائی ناموں سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے علاقائی نام اس علاقے کی تہذیب و تمدن اور الفاظ کو اپنے اندر سمو لینے کی وجہ سے پڑ جاتے ہیں اور ان کا اپنی اصل شاخ سے بھی سلسلہ باقی رہتا ہے۔

15.2.6 کھڑی بولی اور نواح دہلی کی بولیوں سے اردو کے پیدا ہونے کا نظریہ

اردو کی ابتدا کی متعلق اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں لیکن بہت کم ہی تحریروں میں دلائل اور استدلال سے کام لیا

گیا ہے۔ بیشتر نظریات صرف قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ سندھ میں اردو، دکن میں اردو، پنجاب میں اردو، دہلی اور نواح دہلی میں اردو، اردو اور کھڑی بولی کا رشتہ، اردو اور دڑاویڑی زبانوں کا رشتہ، اردو برج بھاشا سے نکلی ہے، اردو ایک مخلوط زبان ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن میں اردو کی پیدائش کو لے کر کے کچھ نہ کچھ نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ ہاں کسی نے اپنا نظریہ مدلل اور تحقیق کی روشنی میں پیش کیا تو کسی نے صرف قیاس آرائی سے کام لیا۔ کچھ نظریات میں تحقیق کے باوجود بھی کوئی خاص نتیجہ نکلتا ہوا نظر نہیں آتا البتہ ان کے تحقیقی اسلوب کو پسند کیا گیا۔ اردو کی ابتدا سے متعلق بیشتر نظریات میں کچھ نہ کچھ کمی بیشی ضرور مل جاتی ہے اور اخیر میں پروفیسر مسعود حسین خان کے نظریہ کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے اردو کی ابتدا دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں سے بتائی جس میں اردو کی اساس کھڑی بولی کو بتایا ہے جس سے اس کا ڈھانچہ تیار ہوا ہے۔ دیگر بولیوں کے اثرات بھی کھڑی بولی پر پڑتے رہے ہیں اور نتیجتاً اردو وجود میں آئی۔ اسی موضوع کو سمجھنے کے لیے پوفیسر مسعود حسین خان کے نظریے پر تفصیل سے غور کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ پروفیسر مسعود حیسن خان جو ایک مشہور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالہ 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' پر ان کو 1945 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی لیکن اس کے علاوہ انہوں نے لسانیات میں ایک اور تحقیقی مقالہ لکھا جس کا عنوان ہے:

A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu۔ ان کا پہلا مقالہ 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' 1948 میں پہلی مرتبہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔ مسعود حسین خان نے اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں دہلی کی بولیوں کے ساتھ ہی ہریانوی کو اہمیت دی تھی کہ وہ بھی دہلی سے لگے ہوئے علاقے کی ایک بولی تھی اور اب بھی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں احساس ہوا کہ ہریانوی کا اثر بلاشبہ کھڑی بولی پر پڑا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو سے ہریانوی کے اثرات زائل ہوتے گئے۔ مسعود حسین خان فتح دہلی 1193 کو بھی اہم مانتے ہیں کیوں کہ اس کے بعد سے دہلی پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہوا اور اردو کھڑی بولی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں صدیوں کا عرصہ لگا ہے اور کھڑی بولی سب سے اہم ہوتے ہوئے بھی اکیلی ذمے دار زبان نہیں ہے بلکہ ہریانوی، برج اور میواتی کے بھی اثرات اردو پر پڑتے رہے ہیں۔ زبان کی اپنی ایک ساخت ہوتی ہے، اپنا کینوس اور اپنی سمت ہوتی ہے۔ اسے جکڑ بند کرنے پر وہ ارتقا پذیر نہیں ہوسکتی ہے۔ اردو کے ساتھ اس طرح کا کوئی سلوک نہیں ہوا۔ عوام میں وہ رائج رہی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دہلی کے شاہی دربار کی زبان بھی اردو ہی بنی۔ انگریزوں نے بھی اسے فروغ اس لیے دیا کہ یہ عوام کی زبان تھی۔ اس سب سے پیشتر دکن کے سلاطین اسے اپنے محلوں میں وہ حیثیت دے ہی چکے تھے جو مغلیہ عہد کے کسی بادشاہ کے وقت میں نہیں ہوسکی کیوں کہ جب تک اردو ترقی یافتہ اور اس قابل ہوئی تھی کہ اس میں نظام بادشاہی کو چلایا جا سکے تب تک مغلیہ تخت شاہی ہی متزلزل ہو چکا تھا اور بادشاہ برائے نام تھا۔ محل کے باہر دہلی کا سارا نظام انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہی صورت حال پورے ملک میں تھی کہ چھوٹے چھوٹے راجا اور نوابین اپنے تخت پر بیٹھے تو تھے لیکن اصل میں حاکم انگریز ہی تھے۔ اس صورت حال پورے ملک پر سیاسی اثر جو ہوا وہ سب نے دیکھا لیکن زبان کے معاملے یہ بات بڑے ہی وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان و ادب کو اس سے بہت فائدہ ملا کیوں کہ انگریز پورے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جس کے پیچھے ان کی تجارت اور حکومت کو وسعت دینے کی منشا تھی۔ بادشاہوں، نوابوں اور راجاؤں کو زیر کرنے کے بعد انگریزوں نے ایک ایسی زبان کو سرکاری زبان بنانا بہتر سمجھا کہ جسے ہر عام و خاص بولتا اور سمجھتا ہو۔ اسی کے نتیجے میں کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج اور دہلی میں ورناکلر سوسائٹی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان دونوں ادارے اردو زبان کی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ بھی کئی چھوٹے موٹے ادارے اور لائبریریاں نے بھی اردو کی خدمت میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔

مسعود حسین خان کے نزدیک دہلی اور نواح دہلی کی بولیاں اردو کی ابتدا میں معاون ہیں اور اس بات کا خیال انہیں امیر خسروؒ کی مثنوی 'نہ سپہر' سے آیا۔ وہ امیر خسرو کی تحریر سے متاثر ہو کر ان کے ایک فقرے 'دہلی و پیرامنش' یعنی دہلی اور نواح دہلی کی بولیاں سے معنی اخذ کرتے ہیں۔ اسی فقرے سے انہیں تحقیق کی ترغیب ملتی ہے اور وہ دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔ امیر خسروؒ بھی زبان و بیان کے معاملے میں محقق کی حیثیت نہ بھی رکھتے ہوں لیکن پھر بھی اپنے علم کے مطابق انہوں نے جن بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست 'مثنوی نہ سپہر' میں دی تھی وہ قابل غور تو ہے ہی۔ مسعود حسین خان نے نواح دہلی کی بولیوں کی خصوصیات دکنی میں ڈھونڈنے کی کوشش کی نہ کہ پنجابی میں۔ پھر اپنے نظریے میں یہ بات شامل کی کہ مغربی یوپی اور جمنا پار کا علاقہ دہلوی اردو کا منبع ہے یعنی دہلی اور نواح دہلی کو اردو کی جائے پیدائش بتایا۔

کھڑی بولی کی خصوصیت ہے کہ اس کے اسما، ضمائر، صفات اور افعال بالعموم طویل مصوتے یعنی 'الف' پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً:

میرا چھوٹا بیٹا کانپور گیا میرا (ضمیر)، چھوٹا (صفت)، بیٹا (اسم)، گیا (فعل)

مندرجہ بالا کھڑی بولی کا جملہ اردو میں جیوں کا تیوں ہی لکھا جائے گا۔ شمال مشرق دہلی اور مغربی یوپی یعنی بالائی دوآبے میں بسنے والے شہر سہارنپور، بجنور، میرٹھ، مظفرنگر، مرادآباد، رام پور اور یہاں تک کہ بریلی تک کے علاقے کو مغربی یوپی میں شامل کیا جاتا ہے اور یہی علاقہ کھڑی بولی کا بھی ہے حالاں کہ بریلی پر برج اور قنوجی کا بہت خفیف سا اثر دیکھا جا سکتا ہے لیکن مجموعی طور پر بریلی میں کھڑی بولی کا ہی اثر ہے۔ بریلی پر برج بھاشا کے اثرات کو اس لیے بھی تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ بریلی کے جنوب مغرب سے شورسین یعنی برج کا علاقہ بہت دور نہیں ہے۔ برج کا علاقہ دہلی کے جنوب مشرق میں ہے جہاں آگرہ اور متھرا جیسے شہر آباد ہیں جو برج کے خاص گڑھ ہیں لیکن حقیقتاً کھڑی بولی اور بالخصوص اردو کا اثر وہاں تک بھی ہے۔ اس کی وجہ رابطے کے نئے نئے آلات کا ایجاد ہونا اور سفر کی سہولیات میں اضافہ ہونا بھی ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی آنا جانا ہوتا ہے۔ کوئی بھی برج بولنے والا اپنے شہر میں آئے ہوئے کسی شمالی یوپی والے انسان سے ٹھیٹ برج میں بات نہیں کرے گا بلکہ وہ اردو، ہندی اور کھڑی کی مدد سے ہی گفتگو کرے گا ہاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ لہجے میں فرق ضرور ملے گا۔

برج کے اسما، ضمائر، افعال اور صفات الگ مصوتے 'او' پر ختم ہوتے ہیں مثلاً:

میرو چھوٹو بیٹو کانپور گیو میرو (ضمیر)، چھوٹو (صفت)، بیٹو (اسم)، گیو (فعل)

کھڑی بولی یعنی اردو اور برج بھاشا کے کینڈا میں کوئی بھی مماثلت نہیں پائی جاتی ہے ان کی تفریق سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کی جائے پیدائش کھڑی بولی کے علاقے میں ہی ہوئی۔ ہاں یہ ماننا پڑتا ہے کہ برج اور ہریانوی کے اثرات بھی اردو پر پڑتے رہے ہیں اور جب اردو میں اصلاح زبان کی تحریک چلائی گئی تو شاہ حاتم اور ان کے پیروکار نے اردو سے ہریانوی، برج اور دیگر بولیوں کے اثرات کو ختم کر کے اردو کی اصلاح میں اہم کام کیا۔ اردو نے کسی بھی زمانے میں 'او' مصوتے پر ختم ہونے والے اسما، ضمائر، صفات اور افعال کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کا ڈھانچہ کھڑی بولی پر ہی استوار ہوا۔ کھڑی اور اردو کے جمع واحد، اسما، ضمائر، صفات اور افعال تو یکساں تھے اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ ہی کھڑی بولی کا نام اردو پڑ گیا۔ یہ وہی اردو ہے جسے قدیم زمانے میں ریختہ یعنی گرا پڑا تصور کیا گیا تھا۔ امیر خسروؒ نے ہی سب سے پہلے زبان دہلی کو ہندوستانی زبان کہا تھا اور اسی کو ہندی اور ہندوی جیسے نام دیے۔

اردو کے پیدا ہونے میں جو عوامل کارفرما ہیں اور جو وقت اردو کی داغ بیل پڑنے کا ہے اس میں بھی دانشوروں کے درمیان بہت اختلاف

ہے، یعنی اگر اردو کی داغ بیل کا زمانہ تلاش کرنے کی سعی کی جائے تو وہی قیاس آرائیاں ہی ہاتھ لگتی ہیں کوئی کہتا ہے کہ مسلمان سب سے پہلے وادیِ سندھ میں وارد ہوئے اسی زمانے میں اردو کی ابتدا ہوئی، کوئی کہتا ہے کہ مسلم فاتح جب مالا بار میں وارد ہوئے اس زمانے اردو کی داغ بیل پڑی اور کوئی محمود غزنوی کی پنجاب میں تسلط قائم کرنے کے زمانے کو اردو کی بنیاد پڑنے کا زمانہ تصور کرتا ہے۔ان سب میں ایک بات مشترک ہے کہ فلاں جگہ کی مقامی بولی/ زبان میں عربی فارسی اور کچھ حد تک ترکی کے الفاظ کی شمولیت ہوتی گئی اور ایک نئی زبان وجود میں آئی جسے آگے چل کر کے اردو کہا گیا اور فلاں جگہ سے ہی ہجرت کر کے وہ زبان دہلی پہنچی۔ایسے موقعے پر وہ حضرات صرف عربی اور فارسی کے الفاظ کو اہمیت دیتے ہیں جو کہ اردو میں خاصی تعداد میں شامل بھی ہیں لیکن یہاں پر غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ عربی فارسی زبان کے الفاظ سے ہی اردو نہیں بنی ہے بلکہ اس کا کینڈا یعنی ڈھانچہ، اس کی قواعد اور اسما، ضمائر، صفات اور افعال کھڑی بولی جیسے ہیں یا کھڑی بولی سے بہت حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خان کے نظریے کے مطابق اردو کی ابتدا کا زمانہ مسلمانوں کی فتح دہلی (1193) کا زمانہ ہے کیوں کہ اسی واقعے کے بعد سے کھڑی بولی میں عربی اور فارسی کے اثرات مرتسم ہونا شروع ہوتے ہیں۔مسعود حسین خان اردو 1200ء سے 1400ء تک اس کا دور اول شمار کرتے ہیں۔اس دور کا تجزیہ کرنے پر مسعود حسین خان کے مطابق کئی نتائج سامنے آتے ہیں مثلاً:

1۔امیر خسرو جو شاعر ہندوی یا طوطیِ ہند کہے جاتے ہیں ان کی شاعری میں اردو کی ابتدائی غزلیں اور دیگر کلام دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کا تعلق اردو کے اولین دور سے تھا۔

2۔بیشتر صوفیائے کرام کے اقوال اور کلام اور نصائح پر مبنی کتابیں بھی انہیں دوسو سالوں میں لکھی گئی ہیں۔

3۔کھڑی بولی میں عربی اور فارسی الفاظ کا شمول اسی دور سے شروع ہوتا ہے اور کھڑی بولی میں عربی اور فارسی کی وہ آوازیں یعنی حرف بھی داخل ہو جاتے ہیں جن سے کھڑی بولی ناآشنا تھی۔اس طرح کھڑی بولی کی آوازوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہر مختلف آوازوں کو خود میں سمیٹنے اور اس کا اظہار کرنے کے قابل بنی اور ایک دن عربی اور فارسی کی صف میں جا کھڑی ہوئی۔

4۔اردو کے ہندی اور ہندوی نام بھی اسی دور میں امیر خسروؒ کے ذریعے پڑتے ہیں جیسے امیر خسرو نے اپنی مثنوی 'نہ سپہر' میں زبان دہلی بھی لکھا ہے۔

5۔اس وقت کی ہندی، ہندوی یا زبان دہلی ہی سلطنت کے ساتھ نقل مکانی کر کے دور دراز دکن کا سفر کرتی ہے اور جہاں وہ نہ صرف خود میں نئی آوازیں شامل کرتی ہے بلکہ لب ولہجہ بھی بدل لیتی ہے اور اس طرح زبان دہلی وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔

6۔کھڑی بولی سے تشکیل پذیر زبان جب دکن پہنچتی ہے اور وہاں ارتقا کے مراحل سے گزرتے ہوئے فارسی رسم الخط پر سب کو اتفاق ہوتا ہے۔اس طرح اردو کی اصل صورت منظر عام پر آتی ہے۔

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مسعود حسین خان نے اپنے نظریہ میں جن نکات کو پیش کیا ہے دوسرے کسی بھی نظریے میں ان نکات کو تلاش کرنے کی سعی نظر نہیں آتی ہے۔ان چھ نکات کی روشنی میں بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کھڑی بولی سے نکلی ہے۔مسعود حسین خان کھڑی بولی کا تعلق کھڑی بولی اور اس کے توسط سے شورسینی اپ بھرنش سے جوڑتے ہیں کیوں کہ تحقیق میں وہ نمونے کے طور پر اپ بھرنش میں کہے گئے کلام میں کھڑی بولی کے نقوش واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔اپ بھرنش کے آخری دور کے نمونے بھی اس دور کی طویل رزمیہ نظموں میں مل جاتے

ہیں جنھیں 'راسو' کہا جاتا ہے۔اس ذیل میں سب سے اہم اور مشہور چندر بردائی کی نظم 'پرتھوی راج راسو' ہے۔علاوہ ازیں بدھ سادھوؤں اور کچھ گورکھ پنتھ جوگیوں کے یہاں بھی شورسینی اپ بھرنش یا مغربی اپ بھرنش میں کہے ہوئے مستند کلام کے نمونے مل جاتے ہیں جو مدھیہ دیش میں رائج تھے۔کس طرح یہ شورسینی اپ بھرنش مختلف سطحوں پر ارتقا پذیر ہوتی ہے یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ اسی تغیر پذیر اپ بھرنش سے دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں کی تخم ریزی ہوتی ہے اور ان سے مخصوص خطوں میں زبانیں پھوٹتی ہیں یعنی کھڑی، ہریانوی اور میواتی کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔تغیر و تبدل کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے اور کھڑی بولی اردو کا کینڈا بنتی ہے بلکہ اردو کے لیے زمین کا کام کھڑی بولی نے کیا جس پر کہ اردو کی بنیاد استوار ہوئی۔ دہلی اور نواحِ دہلی کی کی تمام بولیوں میں مسعود حسین خان کھڑی کو ہی اولیت دیتے ہیں اور ان کا کھڑی بولی کو ترجیح دینا دلائل کی روشنی میں درست بھی معلوم ہوتا۔ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی کتاب 'تاریخ زبان اردو' کے پہلے ایڈیشن میں وہ اردو کی پیدائش کی معاون بولیوں/ زبانوں میں کھڑی بولی کے بعد ہریانوی کو اولیت دیتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اپنے نظریے کی توسیع کی اور ہریانوی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا اور میواتی کی اہمیت کو بھی اردو کی ابتدا میں انہوں نے اہم بتایا۔

کہا جا سکتا ہے کہ مسعود حسین خان کے نظریے کے مطابق بارہویں صدی کے اختتام پر دہلی اور نواح دہلی میں کھڑی بولی تشکیل پذیر ہوئی جس نے شروع میں ہریانوی کے اثرات قبول کیے اور آگے چل کر جو اردو کے نام سے قابل قبول ہوئی اور اس کی مقبولیت میں آج بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔مسعود حسین خان کا یہ نظریہ اردو کی ابتدا میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ ہے جسے اب تک رد نہیں کیا جا سکا ہے۔

15.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اردو کھڑی بولی سے نکلی ہے۔

☆ اردو کی جائے پیدائش کا علاقہ مغربی یوپی، دہلی اور نواح دہلی سے لے کر متھرا تک پھیلا ہوا ہے۔

☆ اردو اپنی ابتدائی حالت میں دکن پہنچی تھی اور وہاں اس کی ترقی بڑے پیمانے پر ہوئی اور اس میں ادب تخلیق کیا گیا۔

☆ ولی دکنی پہلا شاعر تھا جس نے شمالی ہند کے شعرا کو یہ ترغیب دلائی کہ فارسی کے علاوہ ریختہ یعنی اردو میں بھی اعلا خیالات کی عکاسی کی جا سکتی ہے۔

☆ اردو کی ابتدائی شکل پنجاب میں نمودار نہیں ہوئی بلکہ پنجابی میں عربی فارسی کی شمولیت ہوئی لیکن کوئی نئی زبان سامنے نہیں آئی۔

☆ وادیِ سندھ میں مسلم فاتحین کی وجہ سے قدیم سندھی زبان متاثر ہوئی اور یہاں تک کہ اس کا رسم الخط بھی عربی ہو گیا۔

☆ سندھی اور کھڑی بولی کے کینڈا میں کوئی بھی مماثلت نہیں پائی جاتی ہے۔

☆ مسعود حسین خان کو اردو کے دہلی اور نواح دہلی میں پیدا ہونے کا خیال حضرت امیر خسرو کی مثنوی 'نہ سپہر' سے آیا اور اسی کی بنیاد پر مسعود حسین خان نے دہلی اور نواح دہلی کی بولیاں کا تقابل کیا۔

☆ ولی دکنی اردو کے چاسر ہیں جن کی وجہ سے ریختہ میں شاعری کا رجحان بڑھا اور اس طرح اردو کے فروغ کی ایک نئی داستان لکھی گئی۔

☆ اردو کا ڈھانچہ تو کھڑی بولی پر مبنی ہے اور اس کی مددگار زبانوں/ بولیوں میں ہریانوی، برج بھاشا اور میواتی کا بھی شمار ہوتا ہے کیوں کہ ان

بولیوں ہی کی وجہ سے اردو وسیع ہوئی اور دیگر خوبیاں بھی پیدا ہوئیں۔

- ☆ اردو کے ہریانوی سے پیدا ہونے کا خیال تو کوئی معنی نہیں رکھتا البتہ ہریانوی کے اثرات کھڑی بولی پر لمبی مدت تک پڑتے رہے ہیں جن سے اردو کو ارتقا پذیر ہونے میں مدد ملی۔
- ☆ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے یہ نظریہ منسوب تو محمد حسین آزاد سے ہے لیکن سب سے پہلے ہند آریائی لسانیات کے ماہر روڈولف ہیور نلے نے متعارف کرایا تھا۔
- ☆ پنجابی زبان میں عربی فارسی کے الفاظ نفوذ کر جانے اس میں رچ بس گئے اب وہ پنجابی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔
- ☆ کسی بھی زبان کے پیدا ہونے کا نظریہ قیاس آرائی پر مبنی نہیں ہوسکتا بلکہ اس زبان کینڈا، اس کے اسما، ضمائر، افعال، صفات اور واحد جمع کا مطالعہ کر کے ہی اس کی ابتدا کی تحقیق کی جاسکتی ہے۔
- ☆ کسی بھی زبان کے بننے میں کئی زبانوں کا کردار ہوتا ہے۔
- ☆ امیر خسروؒ کی مثنوی 'نہ سپہر' سے مسعود حسین خان کو جو بارہ دہلوی زبانوں کی فہرست ملی وہی ان کی تحقیق کی بنیاد بنی۔
- ☆ راسو نظمیں شورسینی اپ بھرنش میں لکھی گئی تھیں جس کی سب سے عمدہ مثال چندر بردائی کی کتاب 'پرتھوی راج راسو' ہے۔

15.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
بولی	:	کسی چھوٹے سے خطے میں بولی جانے وہ زبان جس میں ادب تخلیق نہ کیا جاتا ہو
ارتقا	:	ترقی،
محقق	:	تحقیق کرنے والا
مخلوط	:	خلط ملط، گڈمڈ
ملواں	:	ملا جلا، ملا ہوا
حتی کہ	:	یہاں تک کہ
سلاطین	:	سلطان کی جمع
شورسینی	:	متھرا اور اس کے آس پاس کے علاقے کی قدیم پراکرت اور پھر بعد میں اپ بھرنش
اپ بھرنش	:	پراکرتوں میں جب دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہونے لگے تو وہ خالص نہ رہیں اور اپ بھرنش کہلائیں
سلطنت	:	ریاست، جائے حکومت
نظریہ	:	مربوط خیال، کسی چیز کو یا کسی کی طرف دیکھنا، دیدار، نگاہ
قیاس آرائی	:	اندازہ یا تخمینہ لگانا، خیال کرنا، گمان کرنا
مفتوح	:	فتح ہونا، فاتح جسے فتح کرلیں وہ مفتوح کہلائے گا

تسلط	:	حکومت، قبضہ
دلائل	:	دلیل کی جمع، دلیلیں
اتحاد	:	اکٹھا ہونا، جمع ہونا، ایک جٹ ہونا
رسم الخط	:	وہ خط جس میں زبان لکھی جائے جیسے اردو کو فارسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے اور ہندی کو دیونا گری میں
لسانیات	:	زبان کی تاریخ و تشکیل کا علم
امور بادشاہی	:	بادشاہی نظام، درباری کام کاج
متواتر	:	مسلسل، لگاتار
کینڈا	:	ڈھانچہ، Structure
مرتسم	:	نقش کیا گیا، نشان کیا گیا
قرین قیاس	:	جو بات عقل کے معافق ہو
نواحِ دہلی	:	دہلی کا قرب و جوار، دہلی کے آس پاس کا علاقہ
مصوتہ	:	حرف علت یعنی Vowel جو اردو میں صرف تین ہیں 'ا'، 'و'، اور 'ی'
تخم	:	بیج
اقوال	:	قول کی جمع
نصائح	:	نصیحت، اصلاحی باتیں
نفوذ	:	نافذ ہونا، داخل ہونا
نکات	:	نکتہ کی جمع، نکتے، قابل غور باتیں، Points
عوامل	:	عمل کی جمع
مدلل	:	جس بات پر دلیل پیش کی جا چکی ہو
سلاست	:	روانی، سادگی، ہمواری، صفائی
شستہ	:	دھلا ہوا، پاکیزہ، صاف ستھرا، خالص، شفاف
داغ بیل	:	خط یا نشان جو سڑک یا کیاری وغیرہ کے لیے بیلچے یا پھاوڑے وغیرہ سے کھانچے ڈال کر بنایا جائے، بنیاد ڈالنا (مضمون کی مناسبت سے)
تشکیل	:	شکل بننا، ابتدا ہونا، ڈھانچہ تیار ہونا
وارد ہونا	:	اترنا، پیش آنا، نازل ہونا، صادر ہونا
منبع	:	زمین کے اندر سے پانی نکلنے کی جگہ، سوتہ یا چشمے کا منہ، سرچشمہ

15.5 نمونہ امتحانی سوالات

15.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ باغ و بہار کس کی لکھی ہوئی کتاب ہے؟

2۔ اردو کے ملواں زبان ہونے کی بات سب سے پہلے کس نے لکھی؟

3۔ 'دکن میں اردو' کس کی لکھی ہوئی کتاب ہے؟

4۔ 'ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے' محمد حسین آزاد نے کہا تھا لیکن ان سے پہلے بھی یہ نظریہ کس ماہر لسانیات نے متعارف کرایا تھا؟

5۔ مسلمان سب سے پہلے ہندوستان کے کس خطے میں وارد ہوئے تھے؟

6۔ کھڑی بولی کا علاقہ کون سا ہے؟

7۔ آپ کے نزدیک اردو کا سب سے قابل قبول نظریہ کون سا ہے؟

8۔ پروفیسر مسعود حسین خان کی کتاب 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' میں کس زبان کو اردو کی ابتدا کے لیے اہم بتایا گیا ہے؟

9۔ متھرا اور اس کے اطراف کے علاقے میں کون سی پراکرت پھلی پھولی؟

10۔ اردو کھڑی بولی سے نکلی ہے لیکن اردو کی ابتدا میں کھڑی کے علاوہ اور کون کون سی معاون زبانوں کا رول رہا ہے؟

15.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ اردو کے ابتدائی نقوش کب دیکھنے کو ملتے ہیں؟

2۔ ہند آریائی زبان کسے کہتے ہیں؟

3۔ کھڑی بولی سے اردو کا کیا رشتہ ہے؟

4۔ اردو کی مماثلت پنجابی، ہریانوی اور دکنی زبانوں سے ہوتی ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟

5۔ سید سلیمان ندوی نے اردو کی ابتدا کس خطے میں بتائی؟ اور کیوں بتائی اس کی وجوہات بھی لکھیں۔

15.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات؛

1۔ ہند آریائی زبانوں، پراکرتوں، اپ بھرنشوں اور بولیوں کی ترتیب وار تاریخ اردو کی ابتدا تک لکھیں۔

2۔ کھڑی بولی اور نواح دہلی کی بولیاں اردو کی ابتدا میں کس طرح معاون ہیں تفصیل سے لکھیں۔

3۔ اردو کی ابتدا کے متعلق مسعود حسین خان کے نظریے کو تفصیل سے لکھیں۔

15.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو (آٹھواں ایڈیشن) — مسعود حسین خان

2۔	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ
3۔	اردو زبان کے ارتقا میں صفیائے کرام کا حصہ	مولوی عبدالحق
4۔	ہندوستانی لسانیایات کا خاکہ	احتشام حسین
5۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
6۔	اردو لسانیات	نصیر احمد خان
7۔	جدید اردو لسانیات	امیر اللہ خان شاہین
8۔	عام لسانیات	گیان چند جین
9۔	توضیحی لسانیات	عتیق احمد صدیقی
10۔	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹرجی (مترجم عتیق احمد صدیقی)

اکائی 16 : سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

16.2.1 تاریخی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

16.2.2 لسانی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

16.2.3 سیاسی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

16.2.4 تہذیبی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

16.3 اکتسابی نتائج

16.4 کلیدی الفاظ

16.5 نمونہ امتحانی سوالات

16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

16.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.0 تمہید

اردو- ہندی زبانیں اپنی اساس، بنیاد اور قواعدی ڈھانچہ کے اعتبار سے آپس میں بڑا قریبی رشتہ رکھتی ہیں کیونکہ یہ دونوں ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا اصل ماخذ ہند آریائی کے ارتقا کی تیسری منزل پر شورسینی اپ بھرنش کی صورت میں ملتا ہے۔ 1000ء کے بعد شورسینی اپ بھرنش سے جن جدید بولیوں نے ارتقا پایا ان میں سے ایک کھڑی بولی بھی ہے اور اردو- ہندی کا رشتہ براہ راست کھڑی بولی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

اردو اور ہندی کے لسانی اشتراک کی ایک وجہ دونوں زبانوں کے وہ مشترک نام ہیں جو ماضی میں رائج رہے ہیں۔ ہندی والوں کا کھڑی بولی کی جانشینی پر دعویٰ اس وقت مضبوط ہو جاتا ہے جب کھڑی بولی کے اولین شعرا اور نثر نگاروں نے خود اپنی زبان کو 'ہندی' کہا، غالب کے خطوط کے ایک ایک مجموعۂ خطوط کا نام اگر اردوے معلیٰ تھا تو دوسرے کا نام عود ہندی۔ سترہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کے مصنفین اپنی زبان کو 'ہندی' اور 'ہندوی' کہتے تھے گویا کھڑی بولی اس وقت بھی 'ہندی'، 'ہندوی' کہلاتی تھی جب ابھی اردو کا یہ نام متعارف نہیں ہوا تھا اور یہ نام متعارف ہونے کے کچھ عرصہ

بعد تک بھی کھڑی بولی کو 'ہندی'، 'ہندوی' کے نام سے ہی موسوم کیا جاتا رہا۔ اردو اور ہندی کا ایک مشترک نام 'ہندوستانی' بھی رائج رہا ہے۔

اردو-ہندی کے درمیان مشترک رشتہ کا سب سے نمایاں اظہار ان کے لسانیاتی ڈھانچے سے ہوتا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے مصوتوں کی بنیاد خالصتاً ہند آریائی لسانی روایت پر مبنی ہے اور ان دونوں زبانوں میں مصوتوں کی سطح پر مکمل اشتراک پایا جاتا ہے۔ جہاں تک مصمتوں کی بات ہے تو اردو مصمتوں میں سے [بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، ڑھ، کھ، گھ] تمام کی تمام ہکاری آوازیں خالصتاً ہند آریائی ہیں اور ہندی میں بھی اسی طرح موجود ہیں۔ ہکاری آوازوں کے ساتھ معکوسی آوازیں [ٹ، ڈ، ڑ] بھی اردو اور ہندی دونوں میں مشترک ہیں۔ دیگر مصمتوں میں ب، پ، ت، ج، چ، د، ر، س، ش، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی بھی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں البتہ ان آوازوں میں /ن/ کی ایک سے زیادہ آوازیں ہندی میں موجود ہیں جبکہ اردو میں اس کی صرف ایک آواز ہے۔ اردو کی بعض عربی آوازیں [ث، خ، ز، ژ، غ، ف، ق] ہندی میں موجود نہیں ہیں اور ان کی جگہ بالترتیب س، کھ، ج، گ، پھ، کھ کی آوازیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس طرح صوتی آوازوں کے اعتبار سے اردو-ہندی میں واضح لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔ صوتیات کے علاوہ دونوں زبانیں قواعدی اور لفظیات کی سطح پر بھی آپس میں مشارکت رکھتی ہیں۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ اردو اور ہندی جدید ہند آریائی زبانیں ہیں، جن کا رشتہ وسط ہند آریائی زبانوں سے ہوتے ہوئے قدیم ہند آریائی زبان 'سنسکرت' پر منتہی ہوتا ہے۔
- ☆ مغربی ہندی کی بعض بولیوں مثلاً کھڑی بولی، پنجابی، برج بھاشا، ہریانوی، گجراتی اور مراٹھی وغیرہ سے اردو-ہندی متاثر تو ہوئیں لیکن سب سے زیادہ اثرات دونوں زبانوں نے کھڑی بولی سے قبول کیے۔
- ☆ اردو-ہندی کی اساس و بنیاد کھڑی بولی ہے۔
- ☆ اردو-ہندی کے لفظیاتی ڈھانچہ میں کافی حد تک مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔
- ☆ صوتیات، صرفیات اور نحویات کے اعتبار سے بھی اردو-ہندی میں اشتراک پایا جاتا ہے۔

16.2 سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں اردو-ہندی کا لسانی رشتہ

'اردو-ہندی' ہند آریائی خاندان السنہ کی دو اہم زبانیں ہیں۔ جدید ہند آریائی کا عروج وارتقا اصولی طور پر اپ بھرنشوں کو پیش نگاہ رکھ کر کیا جانا چاہیے۔ چونکہ آریاؤں کے ورود ہندوستان اور ان کے پورے ملک پر قابض ہونے کے نظریے کو بھی پیش نگاہ رکھنا ضروری سمجھا گیا اس لیے مستشرقین نے جدید زبانوں کی گروہ بندی کبھی افقی خط پر کی اور کبھی دائرے کی شکل پر۔ ماہرین لسانیات کے مطابق آریا دو گروہوں میں ہندوستان میں وارد ہوئے جبکہ جارج گریرسن نے ان گروہوں کی زبانوں کو ذخیرۂ الفاظ اور صوتیات کی روشنی میں اندرونی اور بیرونی زبانوں میں تقسیم کر کے دیکھا ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی کرتے ہوئے لسانی اشتراکات اور اختلاف کو بھی مدنظر رکھا جائے تو بعض زبانیں اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر ماہرینِ لسانیات کے بنائے ہوئے کسی بھی گروہ میں شامل نہیں ہو سکیں گی۔ اس لیے اس گروہ بندی میں قدرے لچک سے کام لینا ہوگا۔ چنانچہ اپ بھرنشوں کو سامنے رکھتے ہوئے جدید زبانوں کی گروہ بندی اس طرح کی جا سکتی ہے:

(1) مدھیہ-شورسینی [مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی]

(2) مشرقی - ماگدھی [بہاری، اڑیا، بنگالی، آسامی]

(3) مدھیہ پوربی - اردھ ماگدھی [مشرقی ہندی]

(4) جنوبی - مہاراشٹری [مراٹھی]

(5) شمال مغربی - وراچڈ پشاچی [سندھی، لہندا، پنجابی]

ماہرلسانیات نے جدید ہند آریائی زبانوں میں سے مغربی ہندی کوسب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کے خیال میں یہ وہ زبان ہے جس سے مدھیہ پردیش کی بولیوں (ہریانوی، برج، کھڑی بولی، قنوجی، بندلی) نے جنم لیا اور یہ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین بنی۔ ان کا خیال دو بنیادوں پر مبنی ہے۔ اول یہ کہ یہ مدھیہ پردیش (جس کا مرکز دوآبہ گنگا و جمنا ہے) کی نمائندگی کرتی ہے، جسے ہندوستان کے مرکز کے علاوہ آریاؤں کی جنم بھومی بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ویدک عہد سے لے کر 1000ء تک مدھیہ پردیش کی سنسکرت، پراکرت (شورسینی) اور اپ بھرنش (سورسینی) کو سب سے زیادہ عروج حاصل ہوا اور گیارہویں صدی عیسوی کے بعد مدھیہ پردیش کی جغرافیائی حدود میں ہریانوی، برج، کھڑی بولی، قنوجی، بندیلی، گجراتی، راجستھانی اور پنجابی بول چال کی زبانوں کے طور پر رائج ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں سے کون سی بولی سب سے پہلے نکھر کر سامنے آئی۔

16.2.1 تاریخی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

اردو- ہندی زبانوں کا تاریخی ارتقا اپنے وسیع معنوں میں ہند آریائی زبانوں کی تاریخ ہے، جسے قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے، جن کا زمانہ 500ق م سے 1000ء تک محیط ہے۔ وسط ہند آریائی عہد کی اپ بھرنش زبانیں جب معدوم ہونے لگیں تو پورے شمالی ہندوستان میں مغرب سے لے کر مشرق تک طرح طرح کی بولیاں سر اٹھانے لگیں۔ اس عہد میں رائج ہونے والی بولیوں کو ان کے بولے جانے کے علاقے نیز ان کی لسانی خصوصیات کی بنا پر انہیں چار زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(1) بیرونی (2) وسطی (3) اندرونی (4) پہاڑی

بیرونی بولیوں میں مغربی پنجابی (لہندا)، سندھی، مراٹھی، آسانی، بنگالی، اڑیا، میتھلی، مگہی اور بھوجپوری کو شامل کیا جاتا ہے وہیں وسطی بولیوں میں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی آتی ہیں، جنہیں مشرقی ہندی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اندرونی بولیوں میں کھڑی بولی، ہریانوی، برج، بندلی، قنوجی، مشرقی پنجابی، گجراتی، راجستھانی، بھیلی اور خاندیشی آتی ہیں۔ پہاڑی بولیوں اور زبانوں میں نیپالی، گڑھوالی اور شملہ کے قرب وجوار کی بولیاں شامل ہیں۔ متذکرہ بالا قسموں میں سے تیسری قسم (بیرونی بولیوں) میں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی چونکہ شمالی ہندوستان کے ان مغربی علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھیں جن کا تعلق اندرون سے تھا اس لیے ان پانچوں بولیوں نے ایک دوسرے کو کافی حد تک متاثر کیا، یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان بعض مماثلتیں بھی در آئی ہیں۔ اسی لیے گریرسن نے مذکورہ پانچوں بولیوں کو ان کی یکسانیت کی بنا پر 'مغربی ہندی' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے جاملتا ہے، جس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثرات قبول کیے اور اس وقت کی بولیوں میں سب سے ممتاز ادبی حیثیت کی حامل بن گئی۔ اس کے اثرات مغرب میں سرہند اور مشرق میں الہ آباد، شمال میں ہمالیہ کا دامن اور جنوب میں وندھیاچل اور بندیل کھنڈ تک پھیلے ہوئے تھے۔ مغربی ہندی کو پانچ بولیوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

(1) کھڑی بولی یا ہندوستانی (2) ہریانوی جاٹو یا بانگڑو (3) برج بھاشا (4) قنوجی (5) بندیلی

کھڑی بولی اور برج بھاشا مختلف زمانوں میں حکومتی سرپرستی اور عوام سے قربت کے سبب مستحکم ادبی روایات کی حامل بن گئیں۔ اردو اور ہندی دونوں کھڑی بولی کی سچی جانشین ہونے کی دعویدار ہیں۔ یہ قابل ذکر ہے کہ مذکورہ پانچوں بولیوں یعنی کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی نے اردو اور ہندی کو بہت حد تک متاثر کیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مذکورہ پانچوں بولیوں میں سے کھڑی بولی کے اثرات اردو اور ہندی زبان پر بہت زیادہ پڑے تاہم کھڑی بولی میں غیر ملکی زبانوں کے الفاظ شامل ہونے کے سبب یہ مغالطہ فروغ پانے لگا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور باہر سے ہندوستان میں آئی ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کھڑ لی کے ماخذ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں اپ بھرنش کے متون کو سامنے رکھتے ہوئے ماہر لسانیات نے کھڑی بولی کے صرفی ونحوی ڈھانچے کو شورسینی اپ بھرش پر استوار کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ جب جارج گریرسن نے مدھیہ پردیش کی شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ بولیوں کے لیے 'مغربی ہندی' کی اصطلاح ایجاد کی اور مغربی ہندی میں سب سے زیادہ اہم کھڑی بولی ہے جسے سترہویں صدی میں انگریز سیاحوں نے پہلی دفعہ 'ہندوستانی' کا نام دیا تھا۔ اس تناظر میں 'ہندوستانی' کے ادبی روپ کو چھوڑ کر ذریعۂ اظہار کے دو روپ سامنے آتے ہیں، ایک وہ جس کی پرورش و پرداخت مسلمانوں نے کی وہ 'اردو' ہے اور ایک وہ جس کی پرورش ہندوؤں کی 'وہ 'ہندی' ہے لیکن مذکورہ مغالطہ کو ادبی روپ پر محمول کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ادبی روپ اور تقریری روپ میں بہت فرق ہے۔ بقول گیان چند جین:

''اردو اور ہندی بول چال کی شکل میں ایک زبان ہیں لیکن تحریری روپ میں اختلاف کی طرف گامزن ہیں جس کے سبب دونوں کا ادب مختلف ہو جاتا ہے۔'' (ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب، گیان چند جین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۵ء، ص: ۵۶)

دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے دو روپ ہوتے ہیں: ایک بول چال روپ جسے تقریری روپ کہتے ہیں اور دوسرا تحریری روپ۔ لسانیاتی مطالعے کے لیے بول چال کے روپ کو سامنے رکھا جاتا ہے لیکن زبان کے ترقی یافتہ ہونے کا معیار بالعموم تحریری روپ طے کرتا ہے۔ اردو اور ہندی ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کا لسانی جائزہ جب تاریخی تناظر میں لیا جاتا ہے تو اس کے ماضی سے حال تک کی دستیاب تحاریر کو زینہ بنا کر موجودہ بول چال روپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ اردو- ہندی ہند آریائی خاندان کی زندہ زبانوں میں سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مستحکم ادبی روایات کی حامل زبانیں ہیں۔ دونوں نے ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کی تیسری منزل پر مدھیہ پردیش کی شورسینی اپ بھرنش سے ارتقا پایا۔ تاہم مخصوص زمانے میں مخصوص ماحول کے بنیاد پرست عناصر کی علاقائیت، مذہبیت اور قومیت اساس چھلنی سے نکل کر دو مختلف سمتوں میں ترقی کرنے لگیں۔ ایک کھڑی بولی نے جب دو الگ تہذیبی دھاروں پر سفر کا آغاز کیا تو یہ تصور قائم ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ اردو مسلمانوں کی زبان اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ اس حوالے سے سب سے زیادہ غلط فہمیاں جارج ابراہم گریرسن کے 'لسانی جائزۂ ہند' سے عام ہوئیں۔ گریرسن نے مدھیہ پردیش کی جدید زبانوں کے لیے 'مشرقی ہندی' اور 'مغربی ہندی' کی اصطلاحات رائج کیں لیکن وہ ہند آریائی خاندان کی زبانوں کی اندرونی اور بیرونی گروہ بندی کو بھی کوئی مضبوط دلیل پر استوار کرنے میں ناکام رہے جبھی بعد کے ماہرین لسانیات نے ان کی لسانی تقسیم کو مسترد کر دیا اور اردو- ہندی کا ماخذ گریرسین کی تحقیقات کی روشنی میں 'مغربی ہندی' کو تسلیم کر لیا گیا۔ سنیتی کمار چٹرجی نے اسی کو 'مغربی اپ بھرنش' کہا اور دہلی اور اطراف دہلی کی جدید بولیوں [کھڑی بولی، برج بھاشا، ہریانوی، قنوجی اور بندیلی] کا ماخذ بتایا۔ جن ماہر لسانیات نے بارہویں یا تیرہویں صدی عیسوی کے نمونوں کو مغربی ہندی کے نمونے تسلیم کیا وہ غلطی پر تھے کیونکہ وہ یا تو اپ بھرنش کی اس شکل کے نمونے ہیں جو 1000ء کے بعد اپنے اختتامی دور میں اوہٹھ کہلاتی تھی یا پھر

برج بھاشا کی خام شکل کے نمونے تھے۔مغربی ہندی نام کی کسی زبان کوئی وجود نہ تھا۔1000ء کے بعد اپ بھرنش کا دور ختم ہوکر جدید ہندی بولیوں کے ابتدائی آثار نمایاں ہونا شروع ہوجاتے ہیں جن میں سے کھڑی بولی اور برج بھاشا کو خاص اہمیت حاصل تھی۔کھڑی بولی،جس کی اردو اور ہندی ترقی یافتہ شکلیں ہیں ایسے نمونے جن کی بنا پر قطعی طور پر یہ کہا جا سکے کہ اس وقت یہ بول چال کا حصہ بن چکی تھیں،پہلی دفعہ تیرہویں صدی عیسوی میں امیر خسرو کے کلام میں نظر آتے ہیں۔کھڑلی بولی/ ہندوی میں ملنے والے امیر خسرو کے نمونوں کی دستیابی کے بعد یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ موجودہ اردو- ہندی کا وجود تیرہویں صدی عیسوی سے ہے تاہم اس وجود کو صرف ابتدائی روپ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

ماہرین لسانیات اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک زبان کسی دوسری زبان پر کسی نہ کسی صورت میں کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوتی ہے اور لسانیاتی سطح پر اس سے اخذ و استفادہ بھی کرتی ہے۔یہ اثر و قبول کا عمل بعض تاریخی،تمدنی اور سیاسی اسباب و علل کے سبب ہوتا ہے اور اس کے زیر اثر ایک زبان دوسری زبان کے قریب آجاتی ہے اور ایک زبان کی خصوصیات دوسری زبان میں سرایت کر جاتی ہیں۔ہندوستانی زبانوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ یہاں کی زبانیں آریاؤں کی آمد سے لے کر آج تک اپنے ارتقا کے کئی مراحل طے کر چکی ہیں اور ان میں سے اکثر زبانوں کی باہمی لسانی ہم آہنگی آج بھی ان کے بنیادی رشتے کو عیاں کرتی ہے۔اردو اور ہندی ایسی ہی دو جدید ہند آریائی زبانیں ہیں،جو اپنی اصل اور مادہ کے اعتبار سے ایک ہیں۔یہ دونوں زبانیں شورسینی اپ بھرنش اور اس کے بعد کھڑی بولی سے ماخوذ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان لسانیاتی اشتراک کا پایا جانا لازمی ہے۔اردو اور ہندی میں ابتدا سے ہی عربی و فارسی کے عناصر کی آمیزش ہوتی رہی ہے اور اب یہ عناصر ان زبانوں کا جز ولاینفک بن گئے ہیں۔جن کی حیثیت اپنی مسلم ہے اور ان سے صرفِ نظر ناممکنات میں سے ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور ہندی زبانوں کا منبع ہند آریائی خاندان سے ہے لیکن براہ راست ان کا رشتہ کھڑی بولی کے ساتھ ہے۔جب ہند آریائی خاندان کا حوالہ آتا ہے تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ دونوں زبانوں کا شجرۂ نسب سنسکرت اور اس سے بھی پہلے ویدک زبان سے جا ملتا ہے۔ہند آریائی لسانیات کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو نے کھڑی بولی کی کھوکھ سے جنم لیا اور کھڑی بولی کا براہ راست تعلق شورسینی اپ بھرنش سے ہے جو بشمول پنجاب،دہلی اور شمالی ہندوستان کے ایک وسیع علاقہ میں رائج تھی۔کھڑی بولی کا ارتقا دہلی اور شمال مشرقی علاقے میں ہوا،جس نے بعد میں نکھر کر اردو کا روپ اختیار کر لیا،جو ابتدا میں 'ہندی' اور 'ہندوی' کہلایا اور 1193ء میں جب نو وارد مسلمانوں نے دہلی پر فتح کا علم نصب کیا تو ان کا واسطہ اسی زبان سے پڑا،بعد میں اس زبان کو 'ریختہ' بھی کہا گیا اور غالباً اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں اس کا نام 'اردو' پڑا جبکہ لفظ 'ہندی' اردو زبان کے قدیم ناموں میں سے ایک نام ہے۔اس لفظ کے معنی 'بھارتی' یا 'بھارت' سے متعلق ہے۔ہندی زبان انیسویں صدی کے اوائل میں اردو سے بنائی گئی۔انگریزوں کی نفسیاتی پالیسی 'بانٹ کر حکومت کرنا' کے تحت اردو زبان سے اردو- فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ رکھنے سے ہندی زبان وجود میں آئی۔برصغیر کے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اردو ایک نئی زبان ہے اور اس کے مقابلے میں ہندی ایک قدیم زبان ہے۔حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔اردو اگرچہ بہت پرانی زبان نہیں بلکہ ہندی بالکل ایک نئی زبان ہے اور اس کے وجود میں آئے ہوئے مشکل سے دو سو سال ہوئے ہیں۔قدیم عہد میں ہندوؤں کی زبان سنسکرت تھی لیکن،عوامی سطح پر بول چال کی زبان کے طور پر رائج نہ ہو سکنے کے باعث جب یہ ختم ہونے لگی تو ہندوؤں نے اپنی زبان کے تحفظ کے لیے اردو کو ہندی بنا لیا۔اور اس میں سے اردو- فارسی الفاظ نکال کر اس کی جگہ سنسکرت کے بعض الفاظ ملا لیے اس طرح ہندی زبان کا وجود ہوا۔انیسویں صدی کے اواخر میں ہندی کو اردو سے الگ کر کے ہندوستانی کی ایک معیاری شکل کے طور پر اسے

مزید ترقی دینے کی تحریک کا آغاز ہوا، جبکہ ابتدا میں یہ وہ زبانیں تھیں جسے بلاتفریق مذہب وملت ہندو اور مسلمان بولتے تھے اور ملک کے طول وعرض کی بول چال میں یہی زبانیں استعمال کی جاتی تھی حتیٰ کہ مہاتما گاندھی بھی اسی کو تسلیم کرنے کے حق میں تھے۔ کھڑی بولی کے اس نکھرے ہوئے روپ کو جس کا ارتقا دہلی میں 1193ء میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد عمل میں آیا۔ ہند آریائی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی ''ترقی یافتہ اپ بھرنش'' کے نام سے موسوم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اس دور میں شمالی ہند کے میدانی علاقوں کے عوام کی مشترکہ زبان تھی۔

اردو اور ہندی برصغیر کی سب سے اہم زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ برصغیر اپنی تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے ہمیشہ سے ہی بہت متنوع حیثیت کا حامل رہا ہے، جس کی مضبوط ترین دلیل مذکورہ زبانیں رہی ہیں لیکن جب مذہبی بنیاد پر شناخت کو اہمیت دی جانے لگی تو خطے کی اہمیت ثانوی ہوگئی اور ثقافت کی سانسیں بھی دم بخود ہونے لگیں۔ تبدیلی کے اس عمل نے زبان کو سب سے پہلے مجروح کیا۔ وہ زبانیں جو کئی صدیوں تک پورے برصغیر میں رابطے کا ذریعہ رہیں، وہ مذہبی اور سیاسی اختلافات کے زیر اثر اردو اور ہندی میں تقسیم کردی گئیں۔ آج ہم خواہ چلاّتے رہیں کہ اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں نہیں بلکہ ان کا منبع و ماخذ ایک ہے، پھر بھی پوری دنیا انہیں دو الگ الگ زبانیں تسلیم کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔

16.2.2 لسانی پس منظر میں اردو-ہندی کا لسانی رشتہ

ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ زبانیں ایک دوسرے سے الفاظ مستعار لیتی ہیں اور بسا اوقات انھیں مستقل طور پر اپنے اندر ضم بھی کر لیتی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ کبھی بھی کوئی زبان کسی دوسری زبان کا قواعدی ڈھانچہ اختیار نہیں کرتی۔ لسانیات کے باب میں بنیادی اہمیت اس کے صرفی ونحوی ڈھانچے کی ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر کسی زبان کا دوسری زبانوں کے ساتھ اشتراکی رشتہ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کسی زبان کے ماخذ کی نشاندہی بھی اسی ڈھانچے کی بنا پر ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد اصوات اور بنیادی لفظیات کی اہمیت قائم ہوتی ہے۔ لسانی مطالعے میں دخیل الفاظ اور رسم الخط کی اہمیت سب سے آخر میں آتی ہے۔ زبانیں دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لیتی رہتی ہے، اسی طرح ایک زبان ایک سے زیادہ رسوم الخط میں بھی لکھی جاسکتی ہے لیکن کبھی بھی کسی زبان کا بنیادی لسانی ڈھانچہ تبدیل نہیں ہوتا۔ عموماً ایک زبان جب دوسری زبان سے کوئی لفظ مستعار لیتی ہے تو اسے اپنی صرفی خصوصیات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ اسی لسانی اشتراک کو پیمانہ بنا کر اردو-ہندی کے آپسی رشتہ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس پیمانے کی تین سطحیں ہیں: (1) صوتی (2) قواعدی (3) لفظی

(1) صوتی: 'صوتیات' لسانیات کی وہ شاخ ہے جس میں آوازوں کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے، اس میں آوازوں کی بنیاد پر ہی مختلف زبانوں کی تخصیص کی جاتی ہے اور آوازوں کی درجہ بندی کے لیے ان کے مخارج کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے مصوتے اور مصمتے میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مصوتے (Vowels) وہ آوازیں ہیں جن میں آواز کے اعضا گونج کے خلا بناتے ہیں اور جن میں سانس کی ہوا بغیر کسی رگڑ کے گزر جاتی ہے جبکہ مصمتے (Consonants) وہ آوازیں ہیں جن میں سانس کی ہوا کو اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ ملتی ہے اور رگڑ پیدا ہوتی ہے۔

اردو مصوتوں کی تعداد بھی ہندی مصوتوں کے برابر ہے بس فرق اتنا ہے کہ اردو میں اعراب کے استعمال اور بعض حروف کے ضمنی استعمال سے مصوتوں کو نمایاں کیا جاتا ہے جبکہ ہندی میں دس مصوتوں کے لیے باقاعدہ علامتیں موجود ہیں جن میں ماتراؤں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ اردو اور ہندی کے مصوتوں کا ماخذ خالصتاً ہند آریائی لسانی روایت پر مبنی ہے اور ان دونوں زبانوں میں مصوتوں کی سطح پر مکمل یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اردو مصمتوں میں سے ہکاری آوازیں [بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، ڑھ، کھ، گھ] خالصتاً ہند آریائی ہیں اور ہندی میں بھی اسی طرح رائج ہیں۔

اس کے علاوہ معکوسی آوازیں ٹ، ڈ، ڑ، بھی اردو اور ہندی دونوں میں مشترک ہیں۔ دیگر مصمتوں میں ب، پ، ت، ج، چ، د، ر، س، ش، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، وی وغیرہ دونوں زبانوں میں مشترک ہیں حالانکہ 'ن' کی ایک سے زائد آوازیں ہندی میں موجود ہیں جبکہ اردو میں اس کی صرف ایک آواز ہے۔ اردو کی بعض آوازیں مثلاً ث، خ، ز، ژ، غ، ف، ق، خالصتاً عربی ہیں، یہ ہندی میں موجود نہیں ہیں اور ان کی جگہ بالترتیب س، کھ، ج، گ، پھ، ک کی آوازیں مستعمل ہیں۔ گویا گنتی کی چند آوازوں کو چھوڑ کر اردو اور ہندی کے مصمتوں کا ڈھانچہ تقریباً یکساں ہے۔ مصوتوں میں تو صوتی ہم آہنگی یقینی ہے۔ ہندی اور اردو دونوں کے بنیادی مصوتے دس ہیں اور ان میں کوئی تفریق بھی نہیں ہے۔ اگر دونوں کے درمیان حد فاصل کھینچا جا سکتا ہے تو دخیل الفاظ اور رسم الخط کی بنیاد پر۔ ورنہ اردو اور ہندی کی اصل ایک ہی کھڑی بولی ہے اور دونوں صرفی ونحوی اعتبار سے متحد الاصل ہیں۔

(2) قواعدی:

کسی بھی زبان کے قواعد کو دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (i) صرف (ii) نحو۔ اردو اور ہندی کی صرف ونحو، افعال، ضمائر اور حروف وغیرہ تمام کے تمام یکساں ہیں۔ اسی طرح مشتقات کے اصول، مرکبات کے قاعدے، اضافت کے طریقے سب کے سب مماثل ہیں۔

(i) صرف:

علم صرف (Morphology) میں زبان کی چھوٹی سے چھوٹی بامعنی اکائی کا مطالعہ کیا جاتا ہے جبکہ علم نحو (Syntax) میں فقروں اور جملوں میں الفاظ کی ترتیب کا مطالعہ زیر غور ہوتا ہے۔ اردو اور ہندی میں صرفی خصوصیات کا کچھ فرق ضرور موجود ہے لیکن وہ بنیادی ذخیرۂ الفاظ میں نہیں بلکہ دخیل الفاظ کی صورت میں واضح ہوتا ہے۔ دونوں کے بنیادی الفاظ مشترک ہیں تاہم کبھی کبھی جغرافیائی اور تہذیبی اثرات سے ان کے الفاظ میں فرق آجاتا ہے، جبکہ نحوی اعتبار سے دونوں زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے جب اسماء (Noun) پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ کسی ایک زبان کے اسمائے خاص یعنی اشخاص کے نام، خطابات، القابات یا ملکوں اور شہروں کے نام وغیرہ دوسری زبان میں تبدیل نہیں ہوتے۔ جبکہ اسمائے عام مثلاً انسان، جانور، قلم وغیرہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور ہندی میں صرف اسمائے خاص میں لسانی اشتراک پایا جاتا ہے اس کے علاوہ اسمائے عام بھی کافی حد تک مشترک ہیں۔ کسی زبان کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ انہی عام چیزوں کے ناموں مثلاً انسانی اعضا کے ناموں، بنیادی افعال، ضمائر، اعداد، رشتوں کے ناموں اور حروف وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اردو اور ہندی کے اسماء میں باہمی اشتراک کو تین سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یعنی جنس، تعداد اور حالت۔ جنس سے مراد تذکیر و تانیث ہے جو ہندی اور اردو میں یکساں رہتے ہیں۔ یعنی:

☆ جن اسما کے آخر میں /ا/ یا/ ہ/ آتا ہے وہ مذکر اور جن کے آخر میں /ی/ آئے اسے مونث سمجھا جاتا ہے جیسے لڑکا اور لڑکی۔ ان کے بنانے کا قاعدہ بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہے یعنی /ا/ اور/ ہ/ کو/ ی/ میں تبدیل کر کے مذکر سے مونث بنا لیتے ہیں جیسے، بچہ سے بچی اور لڑکا سے لڑکی۔

☆ بعض مذکر اسماء ایسے ہوتے ہیں جن کے آخر میں /ا/ یا/ ہ/ نہیں آتا ہے پھر بھی ان کی تانیث /ی/ کا اضافہ کر کے بنائی جاتی ہے جیسے کبوتر سے کبوتری وغیرہ

☆ اسی طرح اسم کے آخر میں /یا/ کا اضافہ کر کے یا آخری حرف کو/ یا/ میں تبدیل کر کے تذکیر سے تانیث بنانے کا قاعدہ اردو اور ہندی میں

یکساں ہے۔

☆ مذکر اسم کے آخر میں/ ن/ کا اضافہ کر کے یا آخری حرف کو/ ن/ میں تبدیل کر کے بھی تانیث بنانے کا اصول دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے۔

اس کے علاوہ پیشوں کے نام مثلاً فوجی، کاریگر وغیرہ اردو ہندی میں مذکر اور مونث استعمال ہوتے ہیں۔ زبانوں کے نام جیسے عربی، فارسی، ہندی، نیز اوقات کے نام جیسے صبح، شام، رات وغیرہ ہندی اور اردو وغیرہ مونث ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کتابوں کے نام جیسے رامائن، بائبل وغیرہ مونث لکھے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے اسماء ایسے ہیں جن کی تذکیر و تانیث بنانے کے اصول وضوابط اردو- ہندی میں ایک ہی ہیں اور ایک ہی قاعدے کے تحت بنائے جاتے ہیں۔ اس طرح اردو اور ہندی میں اسماء کی جنسی حالتوں میں صرفی یکسانیت دونوں کے لسانی اشتراک کی بین دلیل ہے۔

جب ہم اردو اور ہندی کے اسماء کی تعداد (Number) پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی صرفی اشتراک اس طرح دیکھنے کو ملتا ہے کہ اگر اسم عام ایک ہے تو اصطلاحاً واحد اور ایک سے زیادہ ہے تو جمع کہلاتا ہے اور اس کے بنانے کا طریقہ بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہے۔

☆ عموماً / ا/ یا/ ہ/ پر ختم ہونے الفاظ کے آخری حرف کو/ ے/ بدل کر جمع بنا لیتے ہیں جیسے لڑکا سے لڑکے۔ اس کے علاوہ جن لفظوں کے آخر میں / ی/ موجود ہوتی ہے انہیں/ یاں/ میں بدل دیتے ہیں جیسے لڑکی سے لڑکیاں۔ ان کے علاوہ دیگر الفاظ کے آکر میں/ وں/ یا/ یں/ کا اضافہ کر کے جمع بنانے کا رجحان عام ہے جیسے شہر سے شہروں۔ مذکورہ تینوں اصولوں کے مطابق ہندی میں جمع بنانے کا قاعدہ رائج ہے البتہ اردو کے بہت سے واحد الفاظ کی جمع بنانے کے لیے عربی اور فارسی کے اصولوں کی پیروی کی جاتی ہے۔

☆ چیزوں کی متعینہ تعداد کو شمار کرنے کے لیے اردو اور ہندی میں اعداد ترتیبی بھی میں لسانی اشتراک پایا جاتا ہے جیسے ایک، دو، تین، دس، لاکھ، کروڑ وغیرہ۔ یہ اعداد ترتیبی سنسکرت الاصل ہیں اور اردو- ہندی نے پراکرتوں سے اخذ کیے ہیں۔

☆ اعداد توصیفی (پہلا، دوسرا، دسواں سوواں وغیرہ) بھی دونوں زبانوں میں یکساں مستعمل ہیں البتہ اردو میں فارسی کے اثرات سے ان اعداد کو اول، دوم، سوم بھی لکھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ عدد مکسور یعنی جن سے عدد صحیح کا کوئی حصہ بتایا جاتا ہے' دونوں زبانوں میں مشترک ہیں جیسے پاؤ، ایک تہائی، سوا، ڈیڑھ وغیرہ۔ یہ اعداد بھی سنسکرت الاصل ہیں۔ اسی طرح تعداد اضافی یعنی ایک سے زیادہ تعداد بتانے کے لیے، مثلاً دوگنا، چوگنا، سوگنا اور پیائش کے لیے انچ، گرہ، میٹر، میل وغیرہ دونوں زبانوں میں یکساں استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

☆ اسی طرح اشیاء کی غیر متعین تعداد کے لیے اردو- ہندی میں بہت سے، تھوڑا سا، کئی، زیادہ سے زیادہ، کم سے کم وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

☆ ذاتی صفات کے بیان کے لیے اردو- ہندی میں مشترکہ طور پر بیان ہونے والے الفاظ: ، چھوڑا، بڑا، کمزور، چست، ٹھنڈا، کھرا، کھوٹا، نرم، سیدھا، پیارا وغیرہ رائج ہیں۔

☆ کسی ایک شے کی دوسری سے نسبت دینے کے لیے عام طور پر اسماء کے آخر میں یائے معروف بڑھانے یا آخری حرف کو/ وی/ میں بدل کر یہ اسماء بنا لیے جاتے ہیں جیسے لکھنوی، حیدرآبادی، پنجابی وغیرہ۔ لیکن ہندی میں مذکورہ قاعدہ کے علاوہ اسماء کے ساتھ لاحقہ/ک/ لگا کر بھی ایسے اسمائے نسبتی بنا لیے جاتے ہیں جیسے اتہاسک، ادھیاپک وغیر۔

☆ کسی بھی زبان کے افعال کو اس زبان کی ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی کئی قسمیں ہیں: وہ فعل جس کا تعلق براہ راست فاعل سے

ہوا سے فعل لازم کہتے ہیں۔ ایسا فعل جس کا تعلق فاعل اور مفعول دونوں سے قائم ہو اس کو فعل متعدی کہتے ہیں۔ ان بنیادی اقسام کے افعال اردو- ہندی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں اور ان کا استعمال بھی ایک ہی انداز میں ہوتا ہے۔ اردو- ہندی کے مشترک افعال میں اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، آنا، جانا وغیرہ شامل ہیں۔

☆ بعض افعال مرکب استعمال ہوتے ہیں جیسے کھا جانا، چلے جانا، مار دینا، پڑھ لینا وغیرہ۔ اس طریقے کے مرکب افعال میں بھی ہندی- اردو دونوں زبانوں میں اشتراک نظر آتا ہے۔

☆ ضمیر کی تین قسمیں ہوتی ہیں: متکلم، مخاطب اور غائب جیسے، میں، ہم، مجھے، تم، تجھے، تم کو، اس کو، ان کو، ان کے وغیرہ بھی اردو اور ہندی میں لسانی اشتراک کی حامل ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے قواعد جو اردو میں استعمال کیے جاتے ہیں، عین وہی قاعدے ہندی زبان میں بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ قواعدی سطح پر دونوں زبانوں میں لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں زبانوں کی صرفیات میں تعلیقے کا اہم کردار ہوتا ہے اور الفاظ کی ایک کثیر تعداد اردو- ہندی میں ملحق تعلیقوں سے فعلی بنیاد پر اسماء اور دوسرے الفاظ کے ذریعہ تشکیل پاتے ہیں۔ قدیم اور وسطی اردو- ہندی تعلیقے میں خاص طور پر تین ذرائع یعنی سنسکرت یا قدیم ہند آریائی، پراکرت اور اپ بھرنش یا وسطی ہند آریائی اور فارسی و عربی سے ارتقا پذیر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی زبان سے بھی تعلیقوں کی آمد ہوئی گرچہ ان کی تعداد انگلیوں پر شمار کرنے برابر ہے۔ پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو تعلیقے اردو میں مستعمل ہیں تقریباً وہی ہندی میں بھی رائج ہیں۔ اس طرح دونوں زبانوں کا لسانی رشتہ ہمیشہ سے استوار رہا ہے۔ یہ تعلیقے دو قسم کے ہوتے ہیں (1) سابقے (Prefixes) اور (2) لاحقے (Suffeixes)

'سابقے' ہند- یورپی خاندان کی زبانوں میں سابقے اپنی ترقی کی ایک طویل داستان کے حامل ہیں۔ ابتدا میں یہ آزاد ہیئتوں میں استعمال ہوکر اپنے معنی دیتے تھے لیکن سنسکرت کے ارتقاء کے دوران ان کی آزادی محدود ہوگئی اور یہ محض پابند ہیئتوں میں استعمال ہونے لگے۔ 'لاحقے' بھی براہ راست سنسکرت سے آئے ہیں اور خصوصاً تتسم الفاظ سے جڑے ہوئے ہیں۔ سابقوں اور لاحقوں کی بے شمار مثالیں اردو- ہندی میں مستعمل ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے سنسکرت، عربی اور فارسی زبانوں سے ہیں لیکن اردو اور ہندی بول چال میں نہ صرف مستعمل ہیں بلکہ ان زبانوں کا مستقل حصہ بن چکے ہیں۔ محض سابقوں اور لاحقوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ ہندی کے مستقل الفاظ کو فارسی الفاظ کے ساتھ ملا کر اور عربی فارسی کے مستقل الفاظ کو ہندی الفاظ کے ساتھ ملا کر نئے مرکبات بنانے کی روایت بھی اردو- ہندی کے صدیوں پر محیط ارتقائی عمل کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ایسے مرکب الفاظ بھی دونوں زبانوں میں رائج اور مستعمل ہیں جو خالص ہندی لفظوں کے آپسی ملاپ اور خالص عربی و فارسی الفاظ کے آپسی اختلاط سے بنے ہیں۔

زبان میں 'محاورات' کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہوتی ہے۔ محاورے دو یا دو زائد لفظوں کی ترتیب سے بنتے ہیں اور لغوی معنی کے علاوہ ایسے مجازی معنی بھی مہیا کراتے ہیں جس سے ایک تو مختصر پیرایے میں مافی الضمیر ادا ہو جاتا ہے اور بولنے والی کے کلام میں سلیقگی اور وزن در آتا ہے۔ اسی طرح روزمرہ بھی دو یا دو سے زائد الفاظ سے بنتا ہے لیکن محاورے کے برعکس یہ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح بول چال کی سطح پر بعض کہاوتیں بھی وضع کر لی جاتی ہیں، جن میں ایک وسیع معانی پنہاں ہوتے ہیں۔ اس طرح محاورہ، روزمرہ اور کہاوتوں کے استعمال سے کلام میں شستگی اور سلیقگی کا عنصر پیدا کیا جاتا ہے۔ ہم ذرا اردو- ہندی کے محاوروں، کہاوتوں اور ان کے روزمرہ پر نگاہ ڈال کر دیکھیں تو چوپٹ ہونا، دھجیاں اڑنا،

کوڑیوں کے مول بکنا،منہ پر تالا لگنا،آ بیل مجھے مار،آم کے آم گٹھلیوں کے دام،خواب دینے سے کیا ہوگا؟/ سپنے دیکھنے سے کیا ہوگا وغیرہ ایسے مصادر سے مل کر بنے ہیں جن میں مکمل یکسانیت موجود ہے۔ایسے تمام محاورے اردو- ہندی کے گہرے لسانی رشتے کی دلیل بننے کے علاوہ ہندوستان میں کئی صدیوں کی تہذیبی ہم آہنگی کے بھی عکاس ہیں۔

(ii)نحو:

دیگر زبانوں کی طرح اردو- ہندی کی نحو کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔(1)نحو تفصیلی: جس میں اجزائے کلام اور ان کے تغیرات وتبدلات زیر بحث آتے ہیں جبکہ(2)نحو ترکیبی میں جملوں کی ساخت اوران میں درپیش ترکیب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔نحوِ تفصیلی میں کسی جملے میں اسم (Noun)،ضمیر (Pronoun)،صفت (Adjective)،مصادر (Word Roots) اور حروف (Prepisitions) وغیرہ کی ترتیب اوراس کے استعمال ہونے کی جگہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

نحوِ تفصیلی اورنحو ترکیبی کے ضمن میں اردو- ہندی مشترک خصوصیات اس بات کی بین دلیل ہیں کہ اپنی نحوی اور صرفی ساخت کے اعتبار سے دونوں زبانوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

(3)لفظی:

ماہرین لسانیات کا ماننا ہے کہ زبانوں کی وسعت اوران کی بقا کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ کس حد تک اپنے اندر گردونواح میں بولی جانے والی بولیوں کے الفاظ اپناتے اوراپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔اس تناظر میں دیکھا جائے تو اردواور ہندی میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ ابتدا سے ہی یہ دونوں زبانیں غیر شعوری طور پر ایک ایسے مشترکہ لفظی سرمایے سے مستفید ہوتی رہی ہیں جو نہ سنسکرت اور پراکرتوں کے الفاظ پر مشتمل ہیں بلکہ عربی اور فارسی کے بھی ہزاروں الفاظ اپنے دامن میں سمونے کی وسعت رکھتی ہیں۔اردو- ہندی اپنی اصل اور بنیادی کے اعتبار سے کئی سطحوں پر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہوسکتیں لیکن رسم الخط اوراردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی کثرت کے سبب دو آزاد مستقل بالذات اور الگ الگ زبانیں ہوگئی ہیں۔ چونکہ دونوں زبانوں کا بنیادی ڈھانچہ ہند آریائی ہے اس لیے ان کے ذخیرۂ الفاظ کا بیشتر حصہ ہند آریائی ماخذ پر مشتمل ہے۔یہی وجہ ہے کہ قدیم اردو کے سرمایۂ الفاظ کو تتسم، تدبھو، دیسی،عربی فارسی، ترکی اور دراویدی الفاظ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

تتسم سے مراد سنسکرت الفاظ سے ہے یعنی سنسکرت یا کسی غیر زبان کے الفاظ جب بغیر کسی تبدیلی اور ردوبدل کے استعمال ہوتے ہیں تو تتسم کہلاتے ہیں،جبکہ اس کی بدلی ہوئی رائج مقامی شکل کو تدبھو کہتے ہیں۔

تتسم الفاظ قدیم ہند آریائی دور(500 ق م تا 1500 ق م) سے تعلق رکھتے ہیں۔قدیم ہند آریائی عہد میں زبان کی دو مختلف شکلوں کا ارتقا عمل میں آیا، جنہیں ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت کہتے ہیں۔سنسکرت زبان کا ارتقا 500 ق میں آریاؤں کے ورود ہندوستان سے ہوتا ہے جو 1500 تک آتے آتے زوال پذیر ہوگیا اوراس کی جگہ پراکرتوں نے لے لی۔ وسطی ہند آریائی میں شمالی ہند کے مختلف خطوں میں مختلف قسم کی پراکرت بولیاں رائج ہونے لگیں۔اس بات سے انکار ناممکن ہے کہ ان دونوں زبانوں یعنی ہندی اوراردو کے بول چال کا روپ ایک ہے کیوں کہ ان دونوں کی فعال لفظیات ایک ہی ہیں،جس میں پراکرت سے آئے ہوئے تدبھو الفاظ کی بہتات بھی ہے اور دخیل الفاظ جو فارسی اورعربی کے راستے

آئے،انہیں اردو- ہندی نے اس طرح اپنایا کہ یہ بدیسی الفاظ ان کا جزو بن گئے۔

قدیم اردو میں بے شمار سنسکرت کے الفاظ بالکل اپنی اصل حالت میں استعمال ہوئے ہیں مثلاً سندر، گیان، جل، بالک، سنسار، پیا وغیرہ۔دکنی تصانیف میں تتسم الفاظ کا استعمال کثرت سے ہونے لگا اور ایک خاص مرحلے تک پہنچنے کے بعد رفتہ رفتہ تتسم الفاظ کی تعداد اردو میں کم ہونے لگی اور اس کی جگہ عربی و فارسی الفاظ نے لے لی۔شاہ ظہورالدین حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں کی تحریک اصلاح زبان سے متاثر ہوکر شعراء نے اٹھارویں صدی کے وسط میں تتسم اور تدبھو الفاظ کی ایک بڑی تعداد کو اردو زبان سے خارج کر دیا۔شمالی ہند کی قدیم اردو تصانیف میں بھی تتسم الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے تھے۔''بکٹ کہانی''،''دیوان فائز'' اور''قصہ مہر افروز دلبر'' میں تتسم الفاظ ملتے ہیں البتہ''عاشور نامہ''،''کربلا کتھا'' وغیرہ میں تتسم الفاظ کی تعداد نسبتاً کم ہے۔تدبھو الفاظ کی بنیاد بھی اگر چہ سنسکرت ہے لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی شکل وصورت اور شکل میں بھی تبدیلی در آئی۔اردو میں ایسے الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کا ماخذ سنسکرت یا قدیم ہند آریائی ہے اور جو درمیانی ہند آریائی ہے۔اردو کے لفظی سرمایے کا انحصار زیادہ تر وسطی ہند آریائی (پراکرت اور اپ بھرنس) ہے۔یہی وجہ ہے کہ تتسم الفاظ کے مقابلے میں اردو میں تدبھو الفاظ کی تعداد زیادہ ہے۔اردو نے پراکرت اور اپ بھرنش سے کثیر تعداد میں ایسے الفاظ لیے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کا لفظی سرمایہ بھی شاہ حاتم کے عہد تک ایک بڑی حد تک ہند آریائی تھا لیکن تحریک اصلاح زبان کے زیر اثر اس عہد کے شعرا نے زبان کے ایک کثیر سرمایۂ الفاظ کو متروک قرار دے دیا اور اس کی جگہ عربی اور فارسی کے الفاظ نے لے لی۔

اردو- ہندی میں پائی جانے والی بے شمار مماثلتوں کے باوجود ان دونوں زبانوں میں تلفظ، روزمرہ، محاورات، ضرب الامثال، ذخیرۂ الفاظ، مرکبات لفظی، تعلیقوں یعنی سابقے اور لاحقے، قواعدی زمروں یعنی تعداد و جنس، حروف اور بعض نحوی ساختوں کا نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔دونوں زبانیں اپنی روایات، تلمیحات، اشارات، اصناف شعر، اوزان و بحور، ادبی رویوں اور تاریخی وتہذیبی حوالوں نیز لسانی مزاج کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔مزید یہ کہ دونوں زبانیں اپنی علمی و ادبی اصطلاحات اور تہذیبی لفظیات بھی الگ الگ ماخذوں سے لیتی ہیں۔ان سب باتوں کے علاوہ اردو اور ہندی کا الگ الگ رسم الخط ان دونوں کو ایک امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔موجودہ صورت میں اردو اور ہندی دونوں معیاری زبانوں کا درجہ رکھتی ہیں اور اپنی علاقائی حدوں کو عبور کر کے ایک وسیع تر لسانی دائرہ بناتی ہیں۔

اردو اور ہندی کا صرفی ونحوی ڈھانچہ ایک ہے کیونکہ دونوں زبانوں کی اساس ایک ہی ہے۔دونوں زبانوں میں مماثلت اسماء کی مختلف اقسام، جنس، تعداد، فاعلی اور مفعولی حالتوں اور اسمائے صفات کی تمام اقسام کی یکسانیت میں نظر آتی ہے۔افعال کے سیاق میں دیکھیں تو اردو اور ہندی کے مفرد اور مرکب افعال کا بڑا ذخیرہ مشترک ہے۔ضمائر کی تمام اقسام اور حروف کا استعمال اور بنیادی لفظیات جیسے رشتوں کے نام، اعضائے جسمانی کے نام، جانوروں کے نام، مخصوص آوازیں، خوشی اور غمی کے الفاظ، عام جگہوں کے نام، اشیائے خوردنی، سبزیوں، پھلوں کے نام سب مشترک ہیں۔مشترک فعلی مادوں سے ایسے سیکڑوں مشتق الفاظ بنائے جاتے ہیں جو دونوں زبانوں میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔مفرد اور مرکب الفاظ کا وافر ذخیرہ، ضرب الامثال، روزمرہ اور محاورات کی کثیر تعداد بھی اردو اور ہندی کا مشترک سرمایہ ہیں۔جملوں میں اسم، اسم صفت، حروف، ضمائر، مصادر کا استعمال دونوں زبانوں میں ایک ہی طریقے سے کیا جاتا ہے۔جملے کی بُنت دونوں زبانوں میں ایک ہی رہتی ہے بس فرق یہ ہے کہ اردو میں فارسی اور عربی الاصل الفاظ کو استعمال کیا جاتا ہے اور ہندی میں سنسکرت یا برج بھاشا کے لفظ کو ترجیح دی جاتی ہے۔اس کے علاوہ دونوں زبانوں میں نمایاں فرق

ان کے رسم الخط کا ہے۔

16.2.3 سیاسی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

بارہویں صدی عیسوی میں جب دہلی اور اس کے قرب وجوار میں ہندی یا ہندوی کا خمیر تیار ہو رہا تھا، عین اسی وقت ترک مسلمان شمالی ہندوستان میں وارد ہوئے اس طرح جدید ہند آریائی زبانوں کے وجود میں آنے کا زمانہ اتفاق سے ایک ہی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب سبھی ہند آریائی زبانیں اپ بھرنش عہد سے نکل کر جدید عہد میں داخل ہونے لگیں۔ ایسے وقت میں مسلمانوں نے شمالی ہندوستان میں داخل ہوکر شہر دہلی کو فتح کر کے اسے اپنا پایہ تخت بنالیا، جس سے یہاں ایک نئی تہذیب اور تمدن کا خمیر تیار ہوا، جس کے دوررس اثرات نمایاں ہوئے اور ان کے اثرات یہاں ارتقا پانے والی زبان پر بھی پڑے۔ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی اور فارسی حکومتی انتظام وانصرام نیز عوام کی عام بول چال کی زبان تھی۔ اس کے علاوہ سلطاین اورا کے مقربین، رؤسا اور امرا کی زبان ترکی تھی۔ یہ تینوں زبانیں مسلمانوں کے ساتھ شمالی ہندوستان پہنچی اور مقامی بولیوں میں ضم ہوگئیں۔ خاص طور پر کھڑی بولی جو اردو اور ہندی کی اصل واساس ہے۔ مذکورہ تینوں زبانوں سے مل کر جو ایک نئی زبان وجود میں آئی اسے ہندی، ہندوستانی، بھاکا، برج بھاکا، کھڑی بولی اردو، اردوے معلیٰ کے نام سے مشہور ہوئی۔

قیام سلطنت دہلی سے عہد عالمگیری کے ابتدائی ایام اس لیے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ اس عرصہ میں فارسی نے کئی جدید ہند آریائی زبانوں سے ربط میں آخران پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ دکن کے مقابلے شمالی ہندوستان میں اردو اور ہندی کو پوری طرح سامنے آنے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا کیونکہ اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی اور وہی تہذیب اور معاشرت نیز شعروادب پر تسلط قائم کیے ہوئے تھی۔ پھر بھی عوامی سطح پر اس کی نشوونما جاری رہی اور بعض صوفی اور سنتوں نے اسے گلے لگا کر پندونصائح اور اپدیش کے لیے اسی زبان کا استعمال کیا۔ اسی زمانہ میں محمد تغلق نے جب دیوگری کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور دکن میں پہلی بار اجتماعی سطح پر کھڑی بولی کے بیج بوئے گئے اور یہ زبان فارسی کے غلبہ نیز برج اور اودھی کے ادبی اثرات کے دائرے سے باہر نکلی تو جلد ہی پھلنے پھولنے لگی اور اس میں ادبی تخلیقات کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ اس عہد کو کھڑی بولی کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی سلطنت سے عہد عالمگیری کے ابتدائی چند برسوں تک برج، اودھی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی کے ارتقا کا زمانہ نہ تو موجودہ ہندی کے ارتقا کا زمانہ ہے اور نہ زبانِ اردو کی ترقی کا زمانہ بلکہ ان دونوں زبانوں کی قدیم شکلوں کے ارتقا کا زمانہ ہے۔ اس عہد تک اردو اور ہندی الگ الگ زبانیں قرار نہیں دی گئی تھیں بلکہ عہد عالمگیری کے ابتدائی برسوں تک نہ تو اردو کی موجودہ شکل متعین ہوئی تھی اور نہ ہی اسے کسی ایک نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس کے کئی قدیم نام جیسے زبان دہلوی، ریختہ، ہندی، ہندوی، ہندوستانی، زبان ہندوستانی، دکنی اور گجری رائج تھے لیکن بعد میں شمالی ہندوستان میں اس مشترکہ زبان کے لیے عربی فارسی رسم الخط کا باقاعدہ استعمال تیرہویں صدی عیسوی سے امیر خسرو کے ہاتھوں ہوا۔ اس ملی جلی زبان کے لیے عربی فارسی رسم الخط اختیار کیے جانے کے تاریخی اسباب ہیں، جس میں مسلمانوں نے ورود ہندوستان کے ساتھ اپنے ساتھ عربی فارسی رسم الخط کا لانا بھی قابل ذکر ہے۔ چونکہ اس زبان کے ارتقائی دور میں شمالی ہندوستان میں دوسرا ایسا کوئی بھی رسم الخط نہیں تھا جسے عربی فارسی رسم الخط پر ترجیح دی تھی، حالانکہ ہندوستان کا ایک قدیم رسم الخط دیوناگری موجود تھا جس کا استعمال سنسکرت جیسی زبانوں کے لیے جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے تمام مصنفین نے بلاتامل عربی فارسی رسم الخط کو اختیار کرنا شروع کردیا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اردو رسم الخط عربی فارسی رسم الخط کی توسیع شدہ شکل ہے۔ اردو نے اس کو اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھال لیا۔ ہندی کے تئیں اردو مخالف نظریات،

اردو کو ہندی کی 'شیلی' قرار دینے اوراس کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کی تجویز پیش کرنے اور اردو اور ہندی کوایک زبانیں قرار دینے کی ابتدا ایودھیا پرساد کھتری سے ہوتی ہے۔کھڑی بولی ہندی سے عربی فارسی الفاظ کا خارجہ اوراس کی جگہ سنسکرت الفاظ کے اندراج کا رجحان انیسویں صدی میں ہی پروان چڑھنے لگا تھا۔اس رجحان کو پھیلانے میں آگرہ کا راجا لکشمن سنگھ پیش پیش تھا۔اس کا خیال تھا کہ ہندی اوراردو مختلف زبانیں ہیں۔ اس کے ملک کے ہندو'ہندی'بولتے ہیں جب کہ مسلمان اردو بولتے ہیں۔جس طرح اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں،اسی طرح ہندی میں سنسکرت الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔انہیں خیالات ونظریات کے تحت ہندی کی شناخت ہندوؤں کی زبان کےطور پر ہونے لگی اوراردوکومسلمانوں کےساتھ منسوب کیا جانے لگا۔

تاریخ کےاوراق شاہد ہیں کہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج (1800) کے قیام کے بعد شمالی ہندوستان کی اس زبان کو جواپنے زمانۂ قیام سے ہی فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی،اب ناگری حروف (رسم الخط) کا لبادہ پہنایا جانے لگا اور ناگری رسم الخط میں ملبوس اس زبان کے لیے کھڑی بولی 'ہندی' کا نام تجویز کیا گیا تاکہ اسے اودھی، برج بھاشا، راجستھانی اور دوسری بولیوں سے ممیّز کیا جاسکے۔اس کے ساتھ ہی فارسی اورعربی الفاظ کے اخراج اوران کی جگہ سنسکرت الفاظ کے اندراج کا طریقۂ کاراختیار کرنے سے جوزبان وجود میں آتی گئی،اسے آہستہ آہستہ غیرمسلموں کی اکثریت نے اپنانا شروع کردیا اوراردو بولنے والوں اوراسے اپنی زبان کہنے والوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی گئی،جس کے سبب سرزمین ہند میں جواس کی جائے پیدائش ہے،اقلیتی زبان بن کررہ گئی۔انیسویں صدی کے اوائل سے ہی اس نئی زبان یعنی کھڑی بولی ہندی کوادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کیا جانے لگا۔اس کا بین ثبوت فورٹ ولیم کالج میں للولال جی اورسدل مشر کی 'جدید ہندی' میں نثری تصانیف ہیں۔

جدید ہندی کا بیج فورٹ ولیم کالج میں بویا گیا اور1850ء کے بعد اسے ترقی حاصل ہوتی گئی،جس کا مقصد سیاسی بھی تھا اور مذہبی بھی۔ اردو-سنسکرت آمیز کرکے جدید ہندی کی تحریک للولال جی کے بعد بنگال اور پنجاب میں نوین چندرائے اوردیانندسرسوتی نے شروع کردی گئی،جس کی بنیاد کٹر مذہب پرستی تھی۔یہی وہ زمانہ تھا جب مذہبی بنیادوں پراردو کے مقابلے کھڑی بولی ہندی کی تحریک کا آغاز ہوا۔اردوزبان اوراس کےرسم الخط کے خلاف منظّم کوششیں کی گئیں۔چونکہ کھڑی بولی کےاردوروپ کا تعلق ابتدا سے ہی مسلمانوں کےساتھ رہا اس لیے بیشتر ہندواسے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے البتہ جب 'کھڑی بولی اردو' مقبولِ عام زبان کی حیثیت سے رائج ہوگئی تب ہندوؤں نے بھی 'کھڑی بولی ہندی' کی جانب توجہ مبذول کی۔اس طرح کھڑی بولی ہندی میں سلسلہ وارنثری نمونے انیسویں صدی سے ہی ملنا شروع ہوجاتے ہیں،جبکہ شاعری کا آغاز بیسویں صدی سے ہوا۔یہ بھی بین حقیقت ہے کہ گلکرائسٹ کےفورٹ ولیم کالج سے 1804 میں مستعفی ہوجانے کے بعداس کے حواریوں نے اردو کےساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔اردواوراس کےرسم الخط کے خلاف ہندوؤں کی سرگرمیاں اورتحریکیں زورپکڑتی گئیں۔مختلف ہندو تنظیمیں بالخصوص برہموسماج،آریہ سماج اور ہندوسماج اردو کی مخالفت اورسنسکرت آمیز ہندی اور ناگری رسم الخط کومشتہرکرنے میں پیش پیش رہیں۔یہاں تک کہ پنجاب کی 'آریہ سماج' نامی تنظیم، جوایک اصلاحی تحریک تھی' کے روحِ رواں سوامی دیانندسرسوتی نے ہندی کا جاننا لازمی قرار دے دیا تھا۔پنجاب کے ہی ایک سماجی کارکن رام پھلواری اپنی تحریروں اورتقریروں کے ذریعہ اردو کےخلاف زہرافشانی کرتے رہے،جس کالازمی نتیجہ یہ نکلا کہ پنجابی ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد جو اردو سے وابستہ تھی، ہندی کی جانب مائل ہوگئی۔1880 میں ہی ہندوؤں کی ایک تنظیم'ہندوسماج' (الہ آباد) کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندی اورناگری رسم الخط کومشتہرکرنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ہندوسماج تنظیم کے زیراہتمام 1884 میں الہ آباد میں ایک کانفرنس منعقدہوئی،جس

میں ہندی کو سرکاری طور پر عدالتوں میں رائج کیے جانے کی تدابیر پر غور وخوض کیا گیا اور بالآخر انیسویں صدی کے اواخر میں ایودھیا پرساد کھتری، راجا شیو پرساد اور بھارتیندو ہریش چندر جیسے لوگوں نے عدالتوں، تعلیم گاہوں اور دفاتر سے اردو کو ہٹا کر ہندی نافذ کیے جانے کے لیے باقاعدہ مہم چھیڑ دی جو منظّم طور پر' کھڑی بولی کا آندولن' کے نام سے موسوم کی گئی۔

راجا شیو پرشاد صوبائی محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ انھوں نے پوری عمر ہندی اور ناگری رسم الخط کی زبردست حمایت کی اور سرکاری دفتروں، عدالتوں سے اردو کا نکال کر اس کی جگہ ہندی کے نفاذ کو ترجیح دی۔ انھوں نے 1868ء میں انگریزی حکومت کے نام ایک میمورنڈم Court) Characters the upper provinces of India) پیش کیا، جس کے خلاف سرسید احمد خاں نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

انیسویں صدی کے اخیر عشرے (1893) میں ہندی اور ناگری رسم الخط کی زبردست حامی تنظیم 'ناگری پرچارنی سبھا' کا قیام بنارس میں عمل میں آیا، جس نے ہندی اور ناگری رسم الخط کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو مخالف سرگرمیوں میں یہ تحریک اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی، جس کا لازمی نتیجہ سرانٹونی میکڈانل (لفٹننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ جات اوراودھ) کے 18/اپریل 1900 کے اس فیصلے کی شکل میں ظاہر ہوا، جس کی رو سے عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی اور ناگری رسم الخط کو اردو کے برابر درجہ حاصل ہوگیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندی اور اردو کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ ہندی کی نشر واشاعت کے لیے 1910 میں پنڈت مدن موہن مولویہ نے ہندی ساہتیہ پریشد کی بنیاد رکھی، جس کا اجلاس اندور (1918) میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا۔ 1923 میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن کی تجویز کے مطابق الہ آباد میں ہندی میوزیم تیار کیا گیا۔

1938ء میں اردو، ہندی کا تنازعہ عوامی سطح کے مختلف نعروں میں نمودار ہوا اور ایک بار پھر اسے سرکاری سطح پر لے جانے کی کوششیں کی گئیں۔ انڈین نیشنل کانگریس جس کا قیام 1885ء میں عمل میں آیا تھا، آگے آئی اور اس طرح اردو- ہندی کی کشمکش میں 'ہندوستانی' کا وجود معدوم ہوگیا۔ اختلافات بڑھتے گئے اور اردو کے بارے میں غلط فہمیاں میں اضافہ ہوتا گیا۔ کبھی اسے ہندی کی ایک شیلی (اسلوب) کہا گیا، کبھی غیر ملکی زبان کا الزام لگا اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔

الغرض 1947 میں آزادیٔ ملک کے ساتھ ہی ہندوستان کے آئین میں 'ہندی' کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا اور اس طرح مذہب اور زبان کی بنیاد پر ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ حالانکہ لسانی حقیقت یہ ہے کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان کی دو شکلیں ہیں اور آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانوں کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے لیکن موجودہ منظرنامے نے ان کو دو الگ الگ زبانوں کی حیثیت دے دی گئی۔ اس طرح اردو زبان جسے بلا تخصیص مذہب وملت ہندو اور مسلمان بولتے تھے اور رابطے کی حیثیت سے ملک کے طول وعرض میں بول چال کی زبان کی شکل میں مروج تھی۔ مہاتما گاندھی نے بھی اردو کے قدیم نام 'ہندی' کو تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس بھاشا کے لیے اردو شبد شروع ہونے سے پہلے ہندو اور مسلمان دونوں اسے ہندی ہی کہتے تھے۔

16.2.4 تہذیبی پس منظر میں اردو- ہندی کا لسانی رشتہ

اردو- ہندی خطۂ برصغیر کی اہم زبانیں ہیں۔ یہ خطہ تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے بہت متنوع رہا ہے، جس کی مضبوط ترین ترین دلیل کے طور پر مذکورہ زبانوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ماہر لسانیات کے خیال میں زبانیں ایک دوسرے سے الفاظ کا تبادلہ کرتی ہیں اور الفاظ کے تبادلے کے نتیجہ میں تہذیبیں اور ثقافتیں بھی در آتی ہیں۔ زبانوں کی ایک دوسرے کے الفاظ کے لین دین کی کہانی اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی تہذیب وثقافت۔ الفاظ کا

یہ لین دین دو سطح پر ہوتا ہے: ثقافتی اور اتصالی۔ ثقافتی لین دین سیاسی دباؤ کے تحت نہیں ہوتا اور نہ ہی یک طرفہ ہوتا ہے، جبکہ اتصالی عاریت عموماً یک طرفہ ہوتی ہے۔ فاتحین کی زبان دین دار اور مفتوحین کی زبان لین دار ہوتی ہے۔ جو ایسے غیر ملکی الفاظ بھی مستعار لیتی ہے جن کے ہم معنی الفاظ اس میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ فارسی اور انگریزی ایسی دو غیر ملکی زبانیں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ اور عہد جدید کی زبانوں کو کافی حد تک متاثر کیا۔ فارسی ایک ایسی زبان تھی جس نے ہمارے ملک میں سات سو برسوں تک سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے غالب رہی۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ہندوستانی زبانوں میں فارسی الفاظ کی آمیزش نہ ہوتی۔ انگریزی زبان کو ہمارے ملک کی سرکاری زبان قرار پائے ہوئے ابھی سو برس بھی نہیں ہوئے ہیں پھر بھی اس کے سیکڑوں الفاظ ہماری زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔

ہر زبان کسی تہذیب وثقافت کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور ہندی ہندوستان کی مخلوط تہذیب کا مظہر ہے جو ہندوستانیوں، عربوں، ترکوں اور ایرانیوں کے میل جول سے وجود میں آئی۔ اس کا برسوں پر محیط تہذیبی پس منظر اس بات کا متقاضی تھا کہ اس میں ہندی، عربی، فارسی، ترکی الفاظ ملے جلے ہوں چونکہ مختلف قوموں کے الفاظ کی فطری طور پر عمل میں آتی ہے، اس لیے اردو اور ہندی میں ان زبانوں کے الفاظ اسی نسبت سے ہیں جس نسبت سے ان کے بولنے والوں کا اس مخلوط تہذیب وثقافت میں حصہ ہے۔

زبان اور تہذیب وثقافت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ قوموں اور تہذیبوں کے میل جول سے زبانوں کا میل جول بھی بڑھتا ہے، چونکہ تہذیب کا دارومدار اور اس کا ارتقا متعدد اسباب کا متقاضی ہوتا ہے، جو ظاہر ہے کہ زبان میں بھی در آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پسماندہ تہذیب والوں کی زبان مفلس نیز ترقی یافتہ تہذیب والوں کی زبان متمول ہوتی ہے۔ جو قومیں معاشی اور مادی اعتبار سے عروج حاصل کر لیتی ہیں ان کی زبان بھی اتنی ہی ترقی کر جاتی ہے۔ اپنے اپنے عہد میں سنسکرت، یونانی، عربی وغیرہ بہت اہم زبانیں تسلیم کی جاتی تھیں، جبکہ عصر حاضر میں انگریزی، جرمن، روسی اور فرنچ وغیرہ جدید تقاضوں پر پورا اترنے کی زیادہ حامل ہیں۔

زبان کے توسط سے ہم قدیم تہذیب وثقافت کا احیا کرنے کا کام بھی لے سکتے ہیں۔ قوم پرستی کا جذبہ اور تہذیبوں کو زندہ کرنے کا کام کسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ فارسی اور ترکی نے اسی جذبہ کے تحت عربی الفاظ کو خارج کر کے اپنے کلاسیکی سرمایۂ الفاظ کا استعمال از سر نو شروع کیا جو تہذیبوں کے احیا کی زندہ مثال ہے، اسی طرح سنسکرت کے تتسم الفاظ جو دو ہزار برسوں تک مستعمل نہیں ہوئے اب انہیں از سر نو ہندی میں استعمال کر کے قدیم تہذیبوں کو زندہ کرنے کا لیا جا رہا ہے۔

تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے اردو- ہندی زبانیں اس لیے زیادہ متنوع اور وسعت کی حامل ہیں کیونکہ انھوں نے ایک دوسرے کے لفظی اثرات قبول کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے اثرات بھی قبول کیے۔ اردو اور ہندی زبان اپنے اندر اتنی وسعت کی حامل ہے کہ یہ دونوں آسانی سے اپنے آغاز سے ہی دوسری زبانوں کے الفاظ آسانی سے قبول کرتی آئی ہیں۔ جب ایک زبان دوسری زبان کے الفاظ مستعار لیتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس زبان اور زبان بولنے والی قوم کے تہذیبی اور ثقافتی عناصر بھی در آتے ہیں۔ اس طرح تہذیبی اور ثقافتی سطح پر اردو اور ہندی کثیر تہذیبوں سے مالا مال ہیں۔ لیکن جب تہذیبی اور ثقافتی شناخت کی جگہ مذہبی شناخت نے لے لی اور ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنی شناخت کو اہمیت دینے لگے تو تہذیب وثقافت کی اہمیت ثانوی ہو گیا ور ثقافتوں کی اس تبدیلی نے سب سے زیادہ منفی اثرات زبانوں پر مرتب کیے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اردو ہندی نے پچپن ہزار الفاظ کا سرمایے میں چالیس ہزار الفاظ سنسکرت اور پراکرتوں سے مستعار لیے ہیں اسی

طرح غیر زبانوں کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنا کر اردو کا بنا دیا گیا ہے۔ گویا محض ایک چوتھائی الفاظ ہی اردو میں عربی، فارسی اور ترکی کے سرچشمے سے آئے ہیں۔ اردو- ہندی کا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ اردو میں مستعمل ہندی الفاظ کی فہرست تیار کرنا محال ہے۔ اردو کا سرمایۂ الفاظ کھڑی بولی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ غیر ملکی الفاظ پر بھی مشتمل ہے جنھیں اردو- ہندی نے اصل کے مطابق نہیں اپنایا بلکہ اس شکل کو اپنانے میں ترجیح دی جو عوام میں رائج تھے۔ سید احمد دہلوی نے ''فرہنگ آصفیہ'' میں لکھا ہے کہ اردو زبان کے 54009 الفاظ میں سے ہندی کے (بشمول پنجابی اور پوربی زبانیں) 21644 الفاظ اور سنسکرت کے (تتسم) 554 الفاظ شامل ہیں۔ اردو میں شامل عربی الفاظ کی تعداد 7584 اور فارسی الفاظ کی تعداد 6041 ہے۔ گویا عربی اور فارسی کے الفاظ کل ملا کر بھی ہندی الفاظ سے بہت کم ہیں۔ فرہنگ آصفیہ کی ترتیب کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اردو ہندی دونوں زبانوں کے دامن میں وسعت بھی آچکی ہے۔ اردو اور ہندی کے بعض بنیاد پرست عناصر نے انہیں تہذیبی بنیادوں پر تقسیم اور تفاوت نمایاں کرنے کی کوششیں ہمیشہ جاری رکھیں لیکن ان زبانوں کے مشترک سرمایے کو کوئی بھی منقسم نہیں کرسکا بلکہ نوآبادیاتی اثرات سے انگریزی الفاظ کے استعمال کا رجحان بھی اس مشترک ذخیرے میں مسلسل اضافے کا باعث بنا ہے کیونکہ یہ زبانیں اپنے اندر اپنی وسعت رکھتی ہیں کہ غیر ملکی زبان کے الفاظ کو بلا چوں و چرا اس طرح اپنے میں ضم کر لیتی ہے کہ پیوندکاری کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔

مذکورہ بالا سیاق میں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو- ہندی کا رشتہ اتنا مضبوط اور گہرا ہے کہ اردو میں مستعمل ہندی الفاظ کی فہرست تیار کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اردو کا سرمایۂ الفاظ کھڑی بولی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ غیر ملکی الفاظ پر مشتمل ہے۔ کبھی اردو زبان میں ہندی الفاظ کی آمیزش ہوئی تو کبھی ہندی نے اردو الفاظ کو اپنایا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اردو- ہندی الگ الگ زبانیں نہیں بلکہ دو الگ الگ روپ ہیں۔

16.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

☆ اردو- ہندی زبانیں خالص ہند آریائی زبانیں ہیں۔

☆ اردو- ہندی زبانیں مشترک المنبع زبانیں ہیں، جس کی ماں کھڑی بولی ہے۔

☆ زبان کی سطح پر اردو- ہندی میں سے کسی ایک کو تقدم زمانی کی حامل گردانا احتیاط کا متقاضی ہے۔

☆ بارہویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارہویں صدی عیسوی تک کے ادبی ذخیرہ پر اردو اور ہندی کی یکساں ملکیت ہے۔

☆ امیر خسرو اردو- ہندی زبان کے مورث اعلیٰ کے طور پر جتنے معتبر اردو والوں کے لیے ہیں، تقریباً اتنے ہی ہندی والوں کے لیے بھی ہیں۔

☆ اردو- ہندی عام بول چال میں ایک زبان ہیں لیکن دونوں کے تحریری روپ جدا جدا ہیں۔

☆ جب سرکاری زبان کے طور پر 'ہندی' اور اس کا رسم الخط 'دیوناگری' رائج کرنے کا مطالبہ منظور ہوا تو اردو زبان اور رسم الخط بھی اسی حیثیت سے رائج رہا۔

☆ انگریزوں نے اردو- ہندی کو جو مساوی درجہ عطا کیا تھا وہ آزادیٔ ہند تک برقرار رہا۔

☆ اردو- ہندی کو ایک دوسرے کے رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے لیکن اس حوالے سے کسی ایک کا رسم الخط اتنا مکمل اور جامع نہیں ہے کہ ایک دوسرے کی تمام صوتیات کو ظاہر کرسکے۔ یعنی اردو رسم الخط میں لکھی گئی ہندی کو اس وقت تک درست پڑھنا ممکن نہیں ہوگا جب تک کہ اعراب

کی سختی سے پابندی نہ کی جائے۔اسی طرح اردو کی مخصوص آوازوں: ص، ث، غ، خ کو ظاہر کرنے کے لیے دیوناگری رسم الخط میں بعض ماتراؤں اور اضافی نقطوں کی مدد لینی پڑے گی۔

☆ اردو- ہندی میں تفریق کی ابتدا دخیل الفاظ سے ہوئی لیکن تفریق کا بنیادی سبب رسم الخط قرار پایا۔

☆ انگریزوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں کسی ایک زبان کے رسم الخط کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی۔

☆ یہ زبانیں دو مختلف فرقوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے مابین سیاسی تعصّبات کی بنا پر دو مختلف سمتوں میں ارتقا پذیر ہو کر اردو اور ہندی کی شکل میں منقسم ہو گئیں۔

16.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	معنی
اساس	بنیاد، جڑ، اصل، ماں
صوتی	آواز، لہجہ، صدا، آہنگ، لحن
متنوع	مختلف قسمیں رکھنے والا، قسم قسم کا، طرح طرح کا، عجیب وغریب
قرب وجوار	آس پاس، اردگرد، نواحی علاقے
معدوم	ختم، غیر موجود، غائب، فنا کیا گیا، ناپید، عنقا، کالعدم
لسانی	لسانیات یعنی زبان سے متعلق
ساخت	بناوٹ، ڈھانچہ، ترکیب، ہیئت، شکل
مصمتہ	ہم آہنگ، صوتی مناسبت رکھنے والے الفاظ
مصوتہ	جن آوازوں کے لیے منہ کو نسبتاً زیادہ کھولنا پڑے۔
مرورِ ایام	مرور= گزرنا، چلا جانا، بیت جانا، پورا ہونا۔ایام= یوم کی جمع بمعنی دن یعنی دنوں کا گزر جانا
السنہ	لسان کی جمع بمعنی زبانیں
مستشرقین	مستشرق کی جمع، علوم وفنون شرقیہ کے مغربی ماہرین
مستحکم	مضبوط، جسے استحکام حاصل ہو، پائیدار، پختہ
متون	متن کی جمع بمعنی عبارت، Text
ایجاد	کسی نئی بات یا چیز کی تخلیق، اختراع، نئی پیدا کی ہوئی چیز
سیاحوں	سیاح کی جمع بمعنی بہت زیادہ سیاحت کرنے والا، بڑا سفر کرنے والا، جابجا پھرنے والا
جزولاینفک	ایسا حصہ جو اس کی اصل سے جدا نہ کیا جاسکے
وثوق	پختگی، یقین کے ساتھ

متنوع	مختلف قسمیں رکھنے والا، قسم قسم کا، طرح طرح کا، عجیب و غریب
ثانوی	دوسرے درجے کا
مستعار	مانگا ہوا، ادھار لیا ہوا، عارضی طور پر لیا ہوا
مافی الضمیر	دل کی بات، نیت، غرض، مطلب، مدعا، مقصد
ضم	ملانا، شامل کرنا، دو چیزوں کا ملنا یا ملایا جانا،
پراکرت	وہ زبانیں جو سنسکرت سے نکلی ہیں
اپ بھرنش	پراکرتوں کی بدلی ہوئی غیر معیاری شکلیں
قبل مسیح	حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل
ورود	کہیں سے آنا
اپدیش	تعلیمات
مشترک المنبع	سوتا یا چشمہ، نکلنے کی جگہ، زمین کے اندر سے پانی نکلنے کی جگہ

16.5 نمونہ امتحانی سوالات

16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1۔ اردو- ہندی کا تعلق کس ہند آریائی عہد سے ہے؟

2۔ 1000ء کے آس پاس دہلی اور قرب وجوار میں رائج ان پانچ بولیوں کے نام بتائیں جنھیں 'مغربی ہندی' سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

3۔ کس بولی کو اردو اور ہندی کی اساس قرار دیا جاتا ہے؟

4۔ اردو اور ہندی کی پیدائش کہاں اور کس صدی میں ہوئی؟

5۔ اردو- ہندی اور کھڑی بولی کے درمیان کس طرح کا رشتہ ہے؟

6۔ کیا اردو- ہندی کا رسم الخط ایک ہی ہے؟

7۔ 'ہندی' اور 'ہندی' کس زبان کے نام ہیں؟

8۔ ہند آریائی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے؟

9۔ دخیل الفاظ سے کیا مراد ہے؟

10۔ رسم الخط کسے کہتے ہیں؟

16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1۔ کھڑی بولی کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے ماخذ کی نشاندہی کیجیے؟

2۔ اپ بھرنشوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جدید زبانوں کی درجہ بندی کیجیے؟

3۔ عہد قدیم کے اردو- ہندی کے مختلف ناموں کی وضاحت کیجیے؟

4۔ کیا اردو- ہندی کے مصوتے اور مصمتوں میں اشتراک پایا جاتا ہے؟ وضاحت کیجیے؟

5۔ اردو رسم الخط اور دیوناگری رسم الخط سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1۔ اردو- ہندی کے قواعدی ڈھانچہ پر روشنی ڈالیے؟

2۔ اردو- ہندی کے لسانیاتی اشتراک پر بحث کیجیے؟

3۔ اردو- ہندی کے رسوم الخط پر ایک نوٹ لکھئے؟

16.6 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1۔	اردو کا ابتدائی زمانہ	شمس الرحمٰن فاروقی
2۔	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ
3۔	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹرجی
4۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	جمیل جالبی
5۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	مسعود حسین خاں